

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۹ ماہ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۱۲ء عدد ۵

فہرست مضامین

۳۲۲

مجلس ادارت شذرات

اشتقاق احمد ظلی

مولانا سید محمد رابع ندوی لکھنؤ

۳۲۵

بابا محمد عثمان کشمیری شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایک شاگرد
ڈاکٹر عارف نوشاہی

جناب شمس الرحمن فاروقی

۳۲۲

ہندوستان میں فارسی مثنوی سرانی کا ایک اجمالی جائزہ

الہ آباد

پروفیسر سید انوار احمد

۳۶۷

بچے کی تعلیم و تربیت میں ولی کا کردار

(مرتبہ)

پروفیسر نسیم محمود

اشتقاق احمد ظلی

۳۸۱

استدراک، تصوف کیا ہے

محمد عمیر الصدیق ندوی

مولانا ہلال احمد قادری

۳۹۳

اخبار علمیہ

ک، ص اصلاحی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

معارف کی ڈاک

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

۳۹۶

غالب اور بدایوں

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یو پی)

محمد رضوان احمد

پین کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

۳۹۷

مطبوعات جدیدہ

ع-ص

۴۰۰

رسید کتب

شذرات

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم ہے۔ ابتداء ہی سے اسے اسلامیان ہند کی متحدہ آواز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ گذشتہ صدی میں آٹھویں دہے کے ابتدائی دنوں سے حکومت اور عدلیہ کی سطح پر ایسے فیصلے کیے جا رہے ہیں جن کی زد براہ راست مسلم پرسنل لا پر پڑتی تھی اور اس کے نتیجے میں وہ مقاصد بری طرح متاثر اور مجروح ہو رہے تھے جن کی ضمانت شریعت اہلی کمیشن ایکٹ میں دی گئی تھی۔ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مسلسل ایسے اقدامات کیے جا رہے تھے جن سے ملک میں یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار ہو۔ مسلمانوں کے ذہنی اور ملی تشخص کی حفاظت اور بقا کے لیے اس صورت حال کے مضمرات باعث تشویش ہی نہیں نہایت خطرناک تھے۔ ملی قیادت نے صورت حال کی سنگینی اور اس خطرہ کے سد باب کے لیے فوری اقدام کی ناگزیر ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداءً اس کا دائرہ کار پرسنل لا سے متعلق معاملات تک محدود تھا۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس کے میدان کار میں وسعت آتی چلی گئی۔ مرکزی حکومت کی سطح پر مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہ ہونے کے باعث ایسے امور کا ایک سلسلہ ہے جن کی زد مسلمانوں کے اسلامی اور ملی تشخص پر پڑتی ہے۔ گذشتہ دنوں میں قانون حق تعلیم، ڈائریکٹ ٹیکسز کوڈ بل، وقف جیسے مسائل سامنے آئے ہیں جن کے مضمرات مسلم اداروں، مدارس اور مساجد کے لیے نہایت خطرناک ہیں۔ بورڈ کے مطالبات کی معقولیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ابھی ضروری ترمیمات کے ذریعہ ان کمیوں اور خامیوں کو دور نہیں کیا گیا ہے۔ بورڈ کو صورت حال کی سنگینی کا پورا احساس ہے۔ چنانچہ ۲۰۱۱ء میں ان مقاصد کے حصول کے لیے جس مہم کا آغاز کیا گیا تھا وہ اب بھی جاری ہے۔

اس پس منظر میں ۲۰-۲۲ اپریل کو ممبئی میں منعقد ہونے والا بورڈ کا بائیسواں آل انڈیا اجلاس خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ بہت سے لوگوں کو اب بھی یہ بات یاد ہوگی کہ ۱۹۷۲ء کا تاریخی اجلاس جس سے بورڈ کی تاسیس کی راہ ہموار ہوئی تھی ممبئی ہی میں منعقد ہوا تھا۔ ممبئی کے مسلمانوں کی ملی مسائل سے وابستگی کی ایک طویل تاریخ ہے، حسب توقع یہ اجلاس پوری طرح کامیاب رہا۔ ممبئی کے مسلمانوں نے پورے جوش اور جذبہ سے اس میں حصہ لیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے آئینی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں ایک روشن باب کا اضافہ کیا۔ عمومی اجلاس کے لیے آزاد میدان کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن وہ اپنی تمام تر وسعت کے باوجود مسلمانان ممبئی کے امنڈتے ہوئے سیلاب کے سامنے تنگ دامانی کا شکار نظر آیا۔ اس اجلاس میں ملت کو درپیش مسائل سے متعلق نہایت اہم تجاویز پاس کی گئیں۔ ان تجاویز کو بروئے کار لانے کے مقصد سے ”آئینی حقوق بچاؤ“ مہم کو جاری رکھنے اور اس میں مزید تیزی لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ حکومتیں دلیل کی زبان ذرا مشکل سے سمجھتی ہیں لیکن طاقت کی زبان ان کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آجاتی ہے۔ ان دونوں کا مناسب امتزاج ہی دراصل کامیابی کی کلید ہے۔ بورڈ کے مطالبات کی معقولیت تو اظہر من الشمس ہے اور گفتگو کی میز پر

حکومت بھی اسے تسلیم کرتی ہے۔ ممبئی کے مسلمان حکومت کو یہ پیغام بھیجنے میں کامیاب رہے ہیں کہ ان مطالبات کے پیچھے ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ طاقت بھی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ حکومت ان مطالبات کی معقولیت تسلیم کرتے ہوئے ”قانون حق تعلیم“ ڈائرکٹ ٹیکسز کوڈ بل، نکاح رجسٹریشن وغیرہ جیسے امور میں بورڈ کی تجاویز کی روشنی میں ضروری ترمیمات کرے گی اور اس طرح ان مسائل کے حل کی مناسب راہ نکل آئے گی۔ بورڈ نے بجا طور پر یوپی کے جواں سال چیف منسٹر جناب اکھلیش یادو کی ستائش کی ہے جنہوں نے زرعی اراضی کے قانون میں بورڈ کے مطالبہ کے مطابق ترمیم کا وعدہ کیا ہے تاکہ وراثت میں لڑکیوں کو بھی ان کا حصہ مل سکے جس کی شریعت کے مطابق وہ حقدار ہیں۔ یہ ایک بڑی کامیابی ہوگی جو مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوششوں کے نتیجے میں حاصل ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ مخلص، بیدار اور فعال قیادت کی رہنمائی میں بورڈ اپنے دوسرے مطالبات کو تسلیم کرانے میں کامیاب ہوگا۔

چند سال پہلے کویت سے یہ خبر آئی تھی کہ وہاں کے غیر ملکی اسکولوں میں ”الفرقان الحق“ نام کا ایک کتاب تقسیم کی جا رہی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۹۹ میں امریکہ سے شائع ہوئی تھی اور خاص طور سے امت عربیہ اور عام طور سے عالم اسلام اس کے مخاطب تھے۔ متوسط سائز کے ۳۶۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ اس کے مرتبین نے اپنا نام الصفی اور المہدی لکھا ہے۔ خاتمہ کے علاوہ اس میں ۷۷ چھوٹے بڑے ابواب ہیں جن کو نام نہاد سورتوں کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دراصل شیطانی آیات کا ناپاک مجموعہ ہے اور اس کے برخود غلط موفیقین کے بقول نعوذ باللہ قرآن کریم کے اس چیلنج کا جواب ہے جس کی جرأت گزشتہ چودہ صدیوں سے زیادہ عرصہ میں بڑے بڑے فصحاء عرب بھی نہ کر سکے۔ بنیادی طور پر یہ عیسائی عقائد کا مجموعہ ہے اور اس کے بارے میں اس کے مرتبین کا خیال خام یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں عیسائی عقائد اور نظریات جاگزیں کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ان کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں۔ یہ ایسی بھونڈی کوشش تھی کہ عام طور پر اس کا نوٹس نہیں لیا گیا لیکن اس سلسلہ میں بڑی تشویش کا پہلو یہ ہے کہ چند دنوں پہلے کویت ہی کے تعلق سے بعض اخبارات میں یہ خبر پھر آئی ہے کہ وہاں اسکول کے بچوں کے درمیان یہ شیطانی کتاب فروخت کی جا رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طویل عرصہ میں کسی نہ کسی سطح پر یہ کوشش جاری رہی ہے گویہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ان کوششوں کا نتیجہ کیا رہا اور نہ یہ معلوم کرنے کا کوئی قرینہ ہے کہ خاص طور سے کویت ہی میں ان کا ارتکاز کیوں ہے۔ پہلے بھی اور اب بھی ان مذموم کوششوں کا نشانہ بچے ہیں جن کے نیم پختہ ذہن کو زیادہ آسانی سے متاثر کیا جاسکتا ہے، قرآن مجید سے مسلمانوں کا تعلق کمزور کرنے اور اس کے بارے میں ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی آرزو عیسائی مشنری اور مستشرقین صدیوں سے اپنے دل و دماغ میں پالتے رہے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرتے رہے ہیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کتاب الہی سے مسلمانوں

کارشتہ کمزور ہو جائے تو پھر ان کا وجود ختم کر دینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جس تہذیب کو دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی کتاب ہے۔ اس شیطانی کوشش کے سلسلہ میں دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ چند افراد کی انفرادی کاوش کا نتیجہ کچھ سادہ لوح شاید یہ بات باور کر لیں لیکن جن لوگوں کو اسلام کے خلاف جاری مغربی یورش کا کسی حد تک ادراک ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ اور اس طرح کی دوسری کوششیں ایک منظم اور مربوط سازش کا نتیجہ ہیں اور اس کے مظاہر مختلف جگہوں پر ایک منصوبہ کے تحت مختلف شکلوں میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ فروری میں بگرام میں امریکی سپاہیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کو جلانے کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔ اپریل میں فلوریڈا کے بدنام زمانہ پادری ٹیری جونز نے علی الاعلان پولس کی بھاری نفری کی موجودگی میں قرآن کریم کو جلانے کی مذموم حرکت کی۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کی دلآزاری، اخلاقی اور مسلمہ انسانی اصولوں کی پامالی کے اس گھناؤنے جرم سے انسانی حقوق کے نام نہاد ٹھیکہ داروں نے نہ تو اسے روکا اور نہ اسے کوئی سزا دی گئی۔ اور ابھی چند دنوں پہلے امریکہ میں اعلیٰ فوجی افسروں کے ایک ٹریننگ کورس کی تفصیلات سامنے آئیں تو پورا عالم اسلام انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کورس میں امریکہ کے فوجی افسروں کو یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ امریکہ کے دشمن شدت پسند نہیں بلکہ خود اسلام ہے جو شدت پسندی کا سرچشمہ ہے۔ اس فلسفہ حیات کو اب مزید برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کو بدلنا ہوگا ورنہ اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام کے خلاف اب آخری اور حتمی جنگ کا وقت آ گیا ہے۔ مکہ اور مدینہ پر ناگاساکی اور ہیروشیما جیسے حملے کیے جاسکتے ہیں وغیرہ۔ اس قسم کی تعلیم امریکی سیکوریٹی اداروں میں عام ہے۔ اس سے پہلے بھی بار بار اس نوع کی چیزیں سامنے آچکی ہیں۔ اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد پٹاگان نے سخت لفظوں میں اس کی مذمت کی ہے اور اسے امریکی اقدار کے منافی قرار دیا ہے۔ لیکن کئی دن گزرنے کے باوجود وائٹ ہاؤس نے اس سلسلہ میں کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اور نہ ہی کسی مسلم ملک نے ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی رد عمل ظاہر کیا ہے۔ یہ تسلیم کر لینا کہ یہ کورس اور اس نوع کی دوسری چیزیں جن کی تفصیلات اب دستیاب ہیں وزارت دفاع کے علم اور مرضی کے بغیر سیکوریٹی اداروں میں جاری اور نافذ تھیں سادہ لوحی کی انتہا ہوگی۔ دراصل وہ صلیبی جنگ جس کا آغاز صدر بش نے اپنے عہد صدارت میں کیا تھا پوری شدت سے جاری ہے۔ صدر اوبامہ کے عہد میں اس میں نہ کوئی کمی آئی اور نہ کسی طرح کی نرمی۔ عہدہ صدارت سنبھالنے کے بعد اوبامہ نے العربیہ کے انٹرویو اور انقرہ اور قاہرہ کی تقریروں میں عالم اسلام کے ساتھ تعلقات میں باہمی احترام پر مبنی جس نئے عہد کے طلوع کی نوید دی تھی اس کی حیثیت سراب سے زیادہ نہ تھی۔ عالم اسلام پر تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوا البتہ ان کو نوبل انعام امن ضرور مل گیا۔ کہنے کو تو بار بار یہی کہا جا رہا ہے کہ امریکہ کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں ہے بلکہ شدت پسندی کے خلاف ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ جنگ دراصل اسلام کے خلاف ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا عالم اسلام کوئی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔

مقالات

بابا محمد عثمان کشمیری

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایک شاگرد کے حالات و تصنیفات

ڈاکٹر عارف نوشا، ہی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۷۶۷ھ/۱۷۰۳-۱۷۶۷ء) کے ایک کشمیری شاگرد بابا محمد عثمان کے حالات برصغیر میں چودھویں صدی ہجری کے بالکل اوائل / انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھے جانے والے علماء کے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ ان تمام تذکروں میں مشترکہ بات متعلقہ حالات کا اختصار اور یکسانیت ہے۔ جن تذکروں میں بابا محمد عثمان کشمیری کے مختصر حالات درج ہوئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: مولوی فقیر محمد جہلمی (۱۲۶۰؟-۱۳۳۳ھ/۱۸۴۲-۱۹۱۶ء) کا حدائق الحنفیہ (تکمیل ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء، اضافہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء)، مولوی رحمان علی (۱۲۴۳-۱۳۲۵ھ/۱۸۲۸-۱۹۰۷ء) کا تذکرہ علمائے ہند (تصنیف ۱۳۰۵-۱۳۰۷ھ/۱۸۸۷-۱۸۹۰ء) اور ابو محمد مسکین حاجی محی الدین مسکین کبروی سرہندی کشمیری (پ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶-۱۸۶۵ء) کا تحائف الارباب فی ذکر الاولیاء الاخیار (تصنیف ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲-۱۸۹۳ء)۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کے بقول ”بابا محمد عثمان بن شیخ محمد فاروق بن شیخ محمد حسنی (کذا: چشتی) عالم، فاضل، فقیہ، محدث تھے۔ علوم مولانا سعد الدین صادق و مولانا حاجی محمد واخوند مقیم السنہ (کذا) سے حاصل کیے۔ پھر وطن چھوڑ کر دہلی میں شاہ ولی اللہ محدث کی خدمت میں پہنچے اور ان سے علم حدیث و کتب شریعت کی اجازت حاصل کی اور علم طریقت کو اخذ کیا۔ جن دنوں ہندوستان میں فتنہ و فساد حاکم تھا (۱)، آپ اپنے وطن میں آگئے اور خواجہ عبدالرحیم پنج کمانی (کذا: شیخ کمانی) سے بھی بہت کچھ فیض حاصل کیا۔“ (۲)

مولوی رحمان علی کو بابا محمد عثمان کے مفصل حالات نہیں ملے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر ”تکملۃ الکتاب“ میں محض چند الفاظ میں یوں کیا ہے:

”بابا محمد عثمان کشمیری ابن شیخ محمد فاروق، ملا سعد الدین صادق وغیرہ

علمائے کشمیر کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمت میں بھی پہنچے اور

حدیث وفقہ کی اجازت حاصل کی۔“ (۳)

حاجی محی الدین مسکین کشمیری نے بابا محمد عثمان کے ہم وطن ہونے کے باوجود ان کے بارے میں کوئی خاص معلومات بہم نہیں پہنچائیں۔ ان کا سال وفات تک نہیں لکھا، جس کا اہتمام وہ دوسرے رجال کے بارے میں اکثر و بیشتر اپنی کتاب میں کیا کرتے ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے:

”شیخ عثمان رادھو، شاہ محمد فاروق بن شیخ محمد چشتی کے بیٹے ہیں۔

انہوں نے مولانا سعد الدین صادق، اخوند ملا سلیمان، ملا محمد مقیم اور ملا حاجی

محمد سے علوم عقلی اور نقلی میں استفادہ کیا اور دہلی شہر میں ختم المحدثین شاہ ولی اللہ

دہلوی سے حدیث کی اجازت کا شرف حاصل کیا اور باطنی علم میں بھی فیض یاب

ہو کر واپس وطن لوٹے۔ یہاں (کشمیر میں) حضرت خواجہ عبدالرحیم نقشبندی

المعروف خواجہ شیخ کمان کے مرید ہوئے اور ان سے تعلیمات پا کر خود بھی معرفت

کا چراغ روشن کیا۔ بابا محمد عثمان جو دت طبع اور حسن تقریر میں یکتا اور بے نظیر تھے۔

جب وفات پائی تو اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔“ (۴)

حاجی محی الدین کشمیری نے بابا محمد عثمان کے ایک مرید رحمہ شاہ (م: ۱۵: ۱۱۸۷ھ

۱۷۷۳ء) کا تذکرہ بھی کیا ہے جو موضع ترچہل پر گنہ چہراٹ میں رہتے تھے۔ (۵)

بابا محمد عثمان کشمیری کے بارے میں دوسرے تذکروں سے دست یاب اطلاعات بس

اسی حد تک ہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کے حالات پر مبنی ایک خودنوشت تحریر پیش کریں جو

دراصل ہمارے اس مقالے کی بنیاد ہے، ہم چاہیں گے کہ ان کے آبا و اجداد اور علمی و روحانی

اساتذہ (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علاوہ) کا مختصر تعارف بھی درج کر دیں۔

شیخ محمد چشتی (جد): بابا محمد عثمان کے جد شیخ محمد چشتی المعروف رادھو، محلہ باغ یوسف

شاہ (سری نگر؟) میں سکونت رکھتے تھے۔ ان کا تعلق حضرت خواجہ طاہر رفیق اشائی (۶) (م: غرہ ذی الحجہ ۱۰۰۱ھ) بن خواجہ ابراہیم اشائی کے قبیلہ سے تھا۔ مولوی حیدر چرنی (۷) (م: ۲۲ صفر ۱۰۵۷ھ) سے عقلی اور نقلی علوم حاصل کیے اور کچھ عرصہ پیشہ تدریس سے منسلک رہے۔ پھر شیخ محمد علی چشتی کی خدمت میں پہنچ کر طریقہ چشتیہ کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ وہ ہمیشہ حضرات چشتیہ کے طریقہ کے مطابق ذکر جہر کرتے تھے۔ ان کے متعدد خلفا ہوئے، جیسے بارہ مولہ میں شیخ محمد چشتی بن شیخ جلال چشتی اور محلہ باغبان پورہ میں شیخ عبدالکریم۔ شیخ محمد چشتی رادھو شاعرانہ مذاق بھی رکھتے تھے، کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک سال میں ایک لاکھ اشعار کہے، وہ اپنے زمانے میں (حضرت بل میں) آنحضرتؐ سے منسوب موئے مبارک کی زیارت کروانے پر مامور تھے۔ ۱۶ شوال ۱۱۲۶ھ / ۱۶ اکتوبر ۱۷۱۲ء کو انتقال ہوا اور اپنے مکان کے پاس ہی دفن ہوئے۔ (۸) انہوں نے شیخ نظام الدین تھامیری کی کسی عبارت (یا رسالہ) کی شرح بھی لکھی تھی۔ اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ ان کے چار بیٹے شیخ علی، شیخ صدیق، شیخ عابد اور شیخ فاروق تھے۔ چاروں اپنے والد کے مرید تھے اور فضل و کمال میں ممتاز تھے۔ چاروں وفات کے بعد اپنے والد کے جوار میں دفن ہوئے۔ (۹)

مولانا سعد الدین صادق (استاد): مولانا سعد الدین صادق اپنے والد مولانا امان اللہ کشمیری دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولانا امان اللہ ہنگامہ نادری میں ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۵۲ھ کو بمقام پانی پت شہید ہوئے تھے۔ (۱۰) مولانا سعد الدین ۱۱۲۶ھ / ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ مباحثہ اور مناظرہ کرنے میں بے مثال تھے۔ پیشہ تعلیم و تدریس تھا، لیکن تصوف کے حقائق و معارف سے بھی بہرہ ور تھے۔ ان کے والد نے انہیں کشمیر سے دہلی بلا لیا تھا۔ وہیں اپنے والد کی شہادت کے کوئی ۳۵ دن بعد ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۲ھ / ۱۷۴۰ء کو رحلت فرما کر اپنے والد کے جوار میں دفن ہوئے۔ (۱۱) ان کے بیٹے مولوی قوام الدین (م: ۱۵ ذیقعدہ ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۵ء) بھی عالم دین اور کشمیر کے شیخ الاسلام تھے۔ شیخ عبدالرحیم نقشبندی کے مرید تھے اور چوبیس سال تک ان کی خدمت میں رہے اور ان کے حالات و کمالات میں رسالہ قوامیہ تصنیف کیا۔ (۱۲)

اخوند ملا سلیمان (استاد): مولانا خواجہ ابوالفتح کلو (۱۳) (م: ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۹ء) کے بیٹے تھے۔ تقریباً ۱۱۰۵ھ / ۱۶۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے والد کے ایک شاگرد ملا عنایت اللہ شال (۱۴)

(م: شعبان ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء) اور بعد میں مولانا عبدالشکور بلخی سے اکتساب علوم کیا۔ علم اسطراب، ریاضی اور حساب میں امتیاز حاصل کیا۔ نواب عنایت اللہ خان صوبہ دار کشمیر کے زمانے میں انہیں صدر مدرس بنایا گیا۔ وہ فجر سے نماز عشاء تک مسلسل تدریس کرتے۔ سرکار کی طرف سے جاگیر ملی ہوئی تھی، اسی پر قناعت کر کے فراغت خاطر کے ساتھ شریعت اور طریقت کی بجا آوری میں منہمک رہے۔ ۳/ربیع الاول ۱۱۶۲ھ/۱۰ فروری ۱۷۴۹ء کو وفات پا کر جامع مسجد کلاں (سری نگر) کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔ (۱۵)

خواجہ عبدالرحیم نقشبندی (شیخ طریقت): خواجہ عبدالرحیم ملقب بہ خواجہ شیخ کمان، ابن خواجہ محمد شریف بن خواجہ محمد اشرف بن خواجہ محمد اتا تاشقندی۔ ان کے آبا و اجداد کے پاس حکومت تاشقند تھی۔ چوبیس سال کی عمر میں اپنے بھائی خواجہ شاہ نیاز نقشبندی کے ساتھ وطن سے نکلے اور پنجاب میں اپنے قرابت دار نواب عبدالصمد خان سیف الدولہ کے ہاں قیام کیا۔ وہاں سے دہلی پہنچے اور محمد شاہ غازی نے انہیں ”شیخ کمانی“ کا خطاب دیا۔ جب جذبہ باطنی غالب ہوا تو بادشاہ کی مصاحبت چھوڑ کر شیخ محمد عابد سنائی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آداب طریقت سیکھے۔ دہلی میں دونوں بھائی خواجہ موسیٰ خان دہ بیدی سے مستفید ہوئے اور اجازت و خلعت پا کر شیخ کے ہم رکاب خراسان چلے گئے۔ خراسان سے واپسی پر میرزا خان حاکم پنجاب کے زمانے میں ایمن آباد کے فوجدار مقرر ہوئے۔ سکھوں اور احمد شاہ درانی کی لڑائی میں ان کے بھائی خواجہ شاہ نیاز شہید ہو گئے تو یہ جموں چلے گئے اور وہاں سے اپنے شیخ طریقت خواجہ موسیٰ خان دہ بیدی سے دوبارہ ملنے ترکستان گئے۔ مرشد نے انہیں کشمیر میں رہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ یہاں جاگیر خریدی اور خلق خدا کی راہ نمائی کرتے رہے۔ متعدد علما و مشائخ ان کے مریدوں میں شامل تھے۔ شیخ الاسلام ملا قوام الدین نے رسالہ ”قوامیہ“ (فارسی) اور شیخ شرف الدین زبگیر نے رسالہ ”روضۃ الشرف“ (فارسی) ان کے حالات و مناقب میں تصنیف کیا ہے۔ ۱۲/جمادی الاول ۱۲۰۰ھ/۱۳/مارچ ۱۷۸۶ء کو ۱۰۱ سال عمر پا کر کشمیر ہی میں فوت ہوئے۔ (۱۶)

بابا محمد عثمان کشمیری کے خود نوشت حالات: خوش قسمتی سے ہمیں بابا محمد عثمان کشمیری کی چند فارسی تصانیف قلمی صورت میں نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد میں ملی ہیں۔ ان میں

سے ایک تصنیف کے دیباچے میں انہوں نے اپنے کچھ حالات بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ تحریر اور ان کی چند تصانیف کی دستیابی ہی دراصل ہمارے اس مضمون کا محرک ہے۔ یہاں پہلے ہم ان کے خودنوشت حالات لکھیں گے، بعد میں ان کی دستیاب تصانیف کا ایک مجمل تعارف پیش کریں گے۔ افسوس کہ مجھے بابا محمد عثمان کشمیری کا نہ تو سال پیدائش اور نہ ہی سال وفات معلوم ہو سکا ہے۔ صرف یہ معلوم ہے کہ وہ ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں زندہ تھے۔ انہوں نے فارسی رسالہ مسئلہ حیات انبیاء کے دیباچے میں اپنے حالات تحریر کیے ہیں۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ، جو راقم السطور نے کیا ہے۔ پیش خدمت ہے:

”خاکسار بابا محمد عثمان بن بابا محمد فاروق بن شیخ محمد چشتی المعروف شیخ بابا۔ کان اللہ لہم فی الدنیا و العقبیٰ - نے چار سال کی عمر میں قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور دس سال کی عمر میں اس سے فراغت پا کر فارسی کی قدیم و جدید نظم و نثر (اور) تاریخ کی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور بارہ سال کی عمر میں متداول رسائل پڑھ لیے۔ اس کے بعد اپنی استعداد کے مطابق نظم و نثر اور غزل و مثنوی پر مشتمل تصنیفات کا مطالعہ کیا اور عربی علوم کا درس لینے لگا۔ اس دیار (کشمیر) میں علوم معقول و منقول کی جن جن کتابوں کا رواج تھا وہ اکابر وقت کی خدمت میں رہ کر تھوڑے ہی عرصے میں پڑھ ڈالیں اور سترہ سال کی عمر میں اساتذہ کی اجازت سے تدریس میں مشغول ہو گیا۔ کم و بیش دو تین سال اسی طرح گزر گئے۔ اسی اثنا میں والد صاحب رحلت فرما گئے اور میرے حالات پریشان ہو گئے۔ چوبیس سال کی عمر میں ہندوستان جا کر سیال کوٹ اور لاہور کے اولیاء اور فضلاء سے ملاقات کرتا ہوا دہلی جا پہنچا۔ وہاں مجھے نواب روشن الدولہ کے قدیم مدرسہ میں تدریس سونپ دی گئی۔ اکابر امراء میں سے ایک امیر کے ساتھ دوستی بھی ہو گئی اور یوں ان دو ذرائع سے میری روزی کا خود بخود بندوبست ہو گیا۔ یہاں مجھے قاضی مبارک (۱۷)، ملا احمد اللہ (۱۸) اور پورب کے دیگر علماء کی صحبت نصیب ہوئی، جن سے حواشی میرزا ہد ہروی (۱۹)، سلم (۲۰) اور مسلم (۲۱) پڑھنے کا موقع ملا۔ اسی دوران متعدد اولیاء کے دیدار کی سعادت بھی حاصل ہوتی رہی۔ کتب (صحاح) ستہ کی اجازت شیخ عبداللہ سالم بصری کے شاگرد حاجی محمد فضل لاہوری (۲۲) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پوتوں (۲۳) سے پائی۔ چودہ سال تک شیخ دہلی شاہ ولی اللہ

محدث نقشبندی عمری کی خدمت میں آنا جانا رہا۔ صحاح ستہ کا بیشتر حصہ، مسند امام احمد، موطائے امام مالک، آثار امام محمد، موطائے امام محمد، حجتہ اللہ البالغہ کا کچھ حصہ، فصوص الحکم کا بیشتر حصہ، فتوحات المکیہ کا کچھ حصہ، عوارف المعارف کا نصف، قصیدہ فارضیہ، الہیات شفا، لمعات، تاویل الاحادیث، عقد الجید، الانصاف، قول جمیل اور ہمعات (۲۳) ان کی خدمت میں پڑھیں۔ کلام مجید کا آخری نصف ان سے سنا اور طرق حدیث، قاعدہ تحدیث اور احکام کی روایت اور استنباط کرنا ان سے سیکھا اور تمام مرویات کی اجازت پائی اور طریقہ نقشبندیہ میں داخل ہو کر اشغال حاصل کیے۔ جب نسبت نقشبندیہ سے کچھ آشنائی ہو چکی تو قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے اشغال بھی سیکھے۔ کیا کیا فائدے تھے جو مجھے حاصل نہ ہوئے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

اڑتیس سال کی عمر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمت سے رخصت ہو کر اپنے وطن (کشمیر) پہنچا۔ ان دنوں وہاں ایک غاصب سکھ جیون (۲۵) کا تسلط تھا، میں (ایسے شخص سے) چند ہزار دام پر مشتمل اپنی چغتائی مدد معاش واگذار کروانے کی بجائے ایک گوشہ گمنامی میں اوراد و وظائف اور معقول و منقول کی تدریس میں مشغول ہو گیا۔ کم و بیش تین سال اسی غربت اور پریشانی میں گزر گئے اور علاقے کے ایک بھی غنی غنی سے۔ خدا انہیں برباد کرے۔ کچھ التفات اور مراعات نہ پائی۔ تا آں کہ بادشاہ اسلام..... (ترجمے میں القاب اور مدحیہ اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں) احمد شاہ غازی نے پنجاب پر حملہ کیا (۲۶) اور سردار نور الدین خان کو کشمیر فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ غیبی کمک سے کشمیر جنت نظیر ان کے ہاتھوں فتح ہوا اور ان کے تصرف میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی نواب منعم الدولہ سدوزئی کشمیر کا صوبہ دار بن کر یہاں آیا اور عدل و احسان قائم کیا اور فقراء و علماء کی قدر دانی ہونے لگی۔ نواب نے اس خاکسار کو بھی طلب فرمایا اور مہربانی کی اور سکھ جیون کے زمانہ تسلط میں میری ضبط شدہ چند ہزار دام کی چغتائی مدد معاش بحال کی۔ اس سے میری کچھ پریشانی دور ہوئی اور فراغت نصیب ہوئی تو حواشی میرزا ہند پر تعلیقات، سلم کی مختصر شرح اور تصوف و حدیث پر مختصر رسائل تصنیف کیے۔ نواب منعم الدولہ کی فرمائش پر میں نے زبدۃ الآثار کا (فارسی) ترجمہ اور فتوحات (مکیہ) کا مختصر (فارسی) ترجمہ سفر سادس تک کیا۔ دو سال کے بعد جب نواب منعم الدولہ واپس چلے گئے تو فقراء کے دشمنوں

نے۔ جو ہمیشہ سے اس جماعت کی عداوت میں آگے آگے رہے ہیں۔ میری واگذار شدہ مدد معاش دوبارہ ضبط کر لی اور مجھ سے مبلغ سو روپیہ بطور جرمانہ لیے گئے۔ دوبارہ پریشان حالی عود کر آئی اور مجھے گوشہ گمنامی میں جانا پڑا۔ تا آن کہ اب ۱۱۸۰ھ (۶۷-۶۸) میں بعض طالب علموں کی تحریک پر نواب مصلح الدولہ نے اس خاکسار کو طلب کیا ہے۔“ (۲۷)

تصنیفات: بابا محمد عثمان نے مذکورہ بالا خودنوشت میں اپنی جن تصنیفات کا ذکر کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ تعلیقات بر حواشی میرزا ہد ہروی۔

۲۔ مختصر شرح سلم۔

۳۔ ترجمہ زبدۃ الآثار۔

۴۔ مختصر ترجمہ فتوحات المکیہ (تاسفر سادس)۔

۵۔ تصوف و حدیث پر مختصر رسائل جن کا نام نہیں لیا گیا۔ انہوں نے آئینہ قدرت کے دیباچے میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض بزرگوں کی درخواست پر انہوں نے صوفیہ کے مشکل کلمات کی شرحیں لکھی ہیں، لیکن نام یہاں بھی نہیں بتایا۔
اس کے علاوہ ان کی دو اور تصانیف بھی ہیں:

۶۔ مکتوبات۔

۷۔ رسالہ در مسئلہ حیات انبیاء۔

بابا محمد عثمان کشمیری شعر گوئی کا مذاق بھی رکھتے تھے اور ان کا فارسی نمونہ کلام دستیاب ہے۔ مندرجہ بالا فہرست میں سے ہمیں فی الحال بابا محمد عثمان کشمیری کی تین تصانیف دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک اور کتاب کشف المعانی جو ان کی تصنیف تو نہیں ہے لیکن شاید اس کا کوئی تعلق ان سے ہو، وہ بھی دستیاب ہے۔ اتفاق سے یہ سب کتابیں ایک ہی جگہ یعنی نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد میں موجود ہیں اور مجھے جون ۲۰۰۳ء میں وہاں دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس کے لیے میں آرکائیوز کے منتظمین کا شکر گزار ہوں۔ آرکائیوز کے ذخیرہ مفتی فضل عظیم بھیروی میں شمارہ: اسلام ۶۴۶ کے تحت ایک ناقص الطرین قلمی بیاض محفوظ ہے۔ اس

بیاض کے کاتب یا قدیم مالک نے اس کے جو ورق شمار لگائے تھے اس کے مطابق اب صرف اور اق ۳۰ تا ۴۴ اور ۷۹ تا ۹۳ باقی بچے ہیں۔ انہی اوراق میں بابا محمد عثمان کی دو نامکمل تصانیف اور ایک مکمل تصنیف نقل ہوئی ہے۔

مکتوبات (نامکمل): مکتوبات اس بیاض میں اوراق ۳۰ تا ۴۴؛ ۸۲ تا ۸۶؛ ۸۹ تا ۹۳ نقل ہوئے ہیں۔ یہ عربی اور فارسی میں ہیں۔ عربی خطوط اپنے استاد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نام ہیں (۲۸) جب کہ فارسی خطوط مختلف افراد کے نام ہیں۔ ان تمام افراد کی شناخت اس لیے بھی مشکل ہے کہ مکتوب نگار نے بعض افراد کو نام کی بجائے ان کے لقب سے یاد کیا ہے اور بعض مکتوب الہیم کے نام اور لقب بھی نہیں لکھے۔ ان میں سے چند خطوط کے مضامین کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ خلیفہ اعظم کے نام، اس میں لکھتے ہیں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ (میرے) جد بزرگوار (شیخ محمد چشتی) چند روز حافظ شیرازی کا یہ شعر مسلسل پڑھتے رہے:

چرا چون لاله خونین دل نباشم؟ کہ با من ز گس او سرگران است

اور گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اس کی شرح لکھتے رہے۔ جب اس شعر پر تامل کیا تو مفہوم واضح ہو گیا جو محض فیض غیبی تھا اور وہ یہ کہ ز گس آنکھ کی طرف اشارہ ہے اور آنکھ بمعنی عین ہے اور ”عین“ سے مراد ذات ہے۔ ”سرگرائی ز گس“ اصحاب ذات بہ جب صفات کی طرف کنایہ ہے۔ خاکسار نے بھی اسی فیض غیبی سے ایک شعر کہا، بعد میں اس پر کچھ اور اشعار کا اضافہ کیا جو آپ کو سنانا چاہتا ہوں:

بسان صید در دام اضطراب طرفہ ای دارم برنگ موی آتش دیدہ تاب طرفہ ای دارم
بدان چون اہل ساحل با امید از بحر غرقابم کہ من از چشمہ سار وحدت آب طرفہ ای دارم
بجد اللہ کہ ظلمت دور شد از شستہ صافی ام بدل از صورت او آفتاب طرفہ ای دارم
۰۰۰ (۲۹) ہر گز نمی یابی کمال دانش ای بیخود کہ من از جو ہر خود پیچ و تاب طرفہ ای دارم

اس مکتوب سے ہمیں یہ پتا بھی چلتا ہے کہ بابا محمد عثمان کا تخلص ”بے خود“ تھا۔

۲۔ مکتوب الیہ نامعلوم، اس خط میں مرزا محمد سلام کو پڑھنے کی تاکید کی ہے۔

۳- نواب عبداللہ خان کے نام۔

۴- نواب نصرت جنگ کے نام۔

۵- مکتوب الیہ نامعلوم جو غالباً کشمیر میں تھا۔ مکتوب نگار سفر قنوج کے بعد دہلی لوٹے اور یہ خط لکھا ”اما از ابتدای ورود دہلی تا امروز ہزاران عریضہ نیاز مرسل گردید، لیکن مجرد چیز رسیدی نرسید تا بہ جواب چہ رسد“۔ اور ”عرضی کہ در خدمت فلانہ فرستادہ بودند، فقیر آن را از نظر عالی گذرانیدہ، ذکر کمی جاگیر بسیار کردہ شد۔ خدا کند کہ آبروی بہ ظہور انجامد۔ مبلغ یک ہزار و سیصد روپیہ بابت زر جاگیر ارسال داشتہ اند“۔

۶- خلیفہ صاحب کے نام۔

۷- فاضل بابا کے نام۔

۸- مخدوم صاحب کے نام؛ لیلۃ القدر کے بارے میں لکھا ہے کہ کس رات اور کس گھڑی میں واقع ہوتی ہے۔ ”ارشاد عالی درجات خود مدظلہ دیدہ ام کہ در سالی این خاکسار ہمراہ خدام کرام ایشان در مسجد ایشان معتکف بود، بیست و یکم ماہ مبارک رمضان از حجرہ خاص بیرون آمدند و یاران را بشارت لیلۃ القدر دادند و بعد چند سال دیگر باز در بندگی ایشان حاضر بودم کہ بیست و ہفتم (رمضان) از معتکف خود جلوہ فرما شدہ فرمودند کہ بہ دعا و صلوة متوجہ باشید کہ اینست لیلۃ القدر ہذا ما نقلت من خط بعض خلفای جدی علیہ الرحمہ والعہدۃ علی الراوی۔ و از جد بزرگوار علیہ الرحمۃ منقول است کہ شب ششم رجب شب قدر مشاہدہ کردند و اشجار را دیدند کہ در سجدہ منحنی گردیدند۔ ایشان مشغول تحریر بودند، قلم از دست ایشان بی اختیار جدا شدہ افتاد“۔

۹- اپنے والد کے ایک خلیفہ کے نام، عربی میں۔

۱۰- نواب صاحب کے نام۔

۱۱- مرشد (حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی) کے نام، یہ غالباً کشمیر سے لکھا گیا ہے اور وہاں کے حالات اور اپنی مایوسیوں پر ایک تبصرہ کیا ہے۔ انہی دنوں حضرت شاہ ولی اللہ محدث کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ/۱۷۴۶-۱۸۲۳ء) کی شادی ہوئی تھی، اس کی مبارک باد بھی لکھی ہے۔ ”خرابی احوال درین کفرستان کرای نوشتن نکند۔ زندگانی بہ آخر رسید۔

روی آرزوی روحانی در آئینہ خیال ندید۔ ہرچند در ذکر و فکر لذتی ہویدا است اما غیب مسموعہ ناپیدا است در اسباب نیکی معاش اگرچہ فراخی است اما دندان بر جگر افشردہ سعی کارہای دنیوی در تراخی است خاکسار وضع خود بر نمی گرداند۔ در ماہ یک مرتبہ از کج مسجد بہ جہت حفظ جان برمی آید و ملاقاتش می نماید۔ انصرا م امرخیر عبدالعزیز صاحب شنیدہ، بہ عرض مبارک باد۔

۱۲- کسی دوست کے نام۔

۱۳- ملا محمد وفا کے نام، اس خط میں مولوی حسام الدین اور کتاب کار نامہ تیمور کے نسخے کا ذکر ہوا ہے جس میں کتابت کی اغلاط تھیں اور مکتوب نگار نے اسی مناسبت سے فارسی کی یہ ضرب المثل نقل کی ہے ”غلط کتاب، اعجاز کتاب است“، یعنی کتاب کی غلطی کا تہوں کا معجزہ ہے۔

۱۴- نواب علی قلی خان کے نام؛ اس خط میں حسن قلی خان کا ذکر بھی ہوا ہے۔

۱۵- ملا محمد متیم کے نام؛ کسی مولوی صاحب کی رحلت کی تعزیت پر۔ مکتوب الیہ ممکن ہے وہی بزرگ ہوں جو بابا محمد عثمان کے استاد بھی تھے۔

۱۶- شیخ طریقت (حضرت شاہ ولی اللہ) کے نام، عربی میں خط طویل القاب کے ساتھ۔

۱۷- شیخ (شاہ) عبدالعزیز کے نام، یہ خط کشمیر سے لکھا گیا ہے اور بابا صاحب نے دہلی میں اپنے استاد زادوں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے دیگر مریدوں اور حاضر باشوں کو یاد کیا ہے اور انہیں سلام بھیجا ہے، جیسے میاں محمد صاحب، میاں محمد رفیع الدین صاحب، میاں عبدالقادر صاحب، صاحب زادہ عالی تبار (شاید شاہ عبدالغنی)، میاں محمد عاشق (پھلتی؟)، میاں نور اللہ، میاں محمد امین، محمد جواد، فصیح اللہ اور کرم بخش۔

۱۸- ایک خط جو ”مخدوما کرما“ کے خطاب سے شروع ہوتا ہے (ورق ۹۰ الف)، اس میں امیر خسرو کے معروف شعر:

ز دریای شہادت چون نہنگ لا بر آرد سر
تیمم فرض گردد نوح را در عین طوفان

کی شرح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ”مرشد مرشد این عارج معارج تقصیر و فروتری حضرت نظام الدین تھانیسری عبارت اول را در نسخہ ای از نسخ خود بتقریب آوردہ و در شرح

آن ذکر کردہ، اور آگے چل کر لکھتے ہیں ”وہ جدا مجد این فقیر عبارتِ اخیر را شرحی کبیر نوشتہ اند کہ خلاصہ آن بہ قلم می آید“ اور اس کا خلاصہ لکھا ہے۔

ترجمہ زبدۃ الآثار منتخب بہجتہ الاسرار موسوم بہ آئینہ قدرت (نامکمل): اس بیاض کے ورق ۸۱ تا ۹۷ پر اس ترجمے کا صرف دیباچہ نقل ہوا ہے اور متن غائب ہے۔ تاہم اس دیباچے کی مدد سے اس ترجمے کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ زبدۃ الآثار شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی عربی کتاب ہے اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات و مناقب پر کتاب بہجتہ الاسرار مؤلفہ نورالدین ابوالحسن علی بن یوسف شافعی المعروف ابن جہضم ہمدانی (م ۷۱۳ھ / ۱۳۱۲ء) کی تلخیص ہے۔ بابا محمد عثمان اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں: ”در خدمت عارف باللہ، مجدد دورہ باز پسین، مقرب درگاہ سبحانی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ السامی مدتی خاک بوسی نمود و آشنا بہ طرق صوفیہ گشت و بہ استدعای بعضی بزرگان اکثر کلمات مشککہ این طائفہ را شرح ہا نوشتہ“۔ پھر احمد شاہ درانی کا دور حکومت (۱۱۶۰-۱۱۸۷ھ / ۱۷۴۷-۱۷۷۳ء) آیا اور نواب منعم الدولہ بلندخان بہادر سدوزئی (صوبہ دار کشمیر) نے ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء میں خطہ کشمیر کو اپنے ورود مسعود سے گلشن آباد بنادیا اور اپنے عدل و انصاف سے کشمیر کو کفار کے ظلم سے پاک کیا۔ نواب صاحب سلسلہ قادریہ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے مترجم کو بھی نوازا اور زبدۃ الآثار کو روزمرہ فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ مترجم نے یہ کام شروع کیا اور اس موقع پر یہ نظم لکھی:

آئینہ قادر قدرت نمای یافتم این ترجمہ جانفزای
نام نہاد آئینہ قدرتش ہاتف غیبی بنگر صفوش
قدر شناسان کہ گہر سفتہ اند دُرج در معرفش گفتہ اند
قدرت قادر ہمہ پیدا درو لطف اسرار ہویدا درو
در چمن ہر ورقش کن نظر راز نہانیست چو گل جلوہ گر
نام خدای حمد شد بجا منتخب بہجتہ الاسرار را
آری ہر مصرع گہری چو حرف یابی تارخ بطرز شگرف
کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے، الہی بہ محض موہبت خاص از نعمت خوان عظیم

الشان احسان ”کانت تراہ“ ماگدایان تہی دست را کہ برخاک مذلت افتادہ ایم۔
رسالہ در مسئلہ حیات انبیاء (مکمل): یہ رسالہ اس بیاض کے ورق ۸۶ الف تا ۸۹ الف نقل ہوا ہے۔ اس کا سبب تصنیف مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

”۱۱۸۰ھ/۶۷-۶۸ء میں (کشمیر کے) نواب مصلح الدولہ نے بعض طالب علموں کی تحریک پر اس خاکسار کو طلب کیا اور مناظرہ اور مسئلہ بیان کرنے کے لیے کہا۔ چون کہ وہ میلاد النبیؐ کے دن تھے، میں نے اس مناسبت سے درود شریف سے متعلق احادیث بیان کیں۔ رفتہ رفتہ بات حدیث ”ما من احد لسلم علی الا رد اللہ علی روحی“ تک جا پہنچی۔ میں نے حاضرین مجلس سے پوچھا کہ بعض اکابر جو انبیاء کی (بعد از ممات) جسمانی حیات کے قائل نہیں ہیں۔ جیسا کہ نسفی اور علاء الدین تونیوی کے کلام سے پتا چلتا ہے اور میرے شیخ، الشیخ احمد المحمدی دہلوی کا مآل الیہ بھی یہی ہے۔ انہوں نے ”رد روح“ (روح کا لوٹنا) کا کیا مطلب لیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں ہے؟ کیوں کہ جب دیگر ارواح مؤمنین کے (اپنے) زائرین سے شعور اور ان کے سلام اور رد سلام (سلام لوٹانے) کے بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں تو حضرات انبیاء کرام کے حق میں اس معنی کے واقع ہونے کے کیا کہنے۔ پھر بھی رد روح (روح کے لوٹنے) کی صورت میں ہر گھڑی اور ہر دن جس کثرت سے آنحضرتؐ پر سلام بھیجا جاتا ہے اسی تعداد میں ان کی موتات کثیرہ لازم آتی ہے۔ یہ عقیدہ اس مذہب جمہور کے منافی ہے جو انبیاء صلوات اللہ علیہم کی جسمانی حیات (بعد ممات) کے قائل ہیں۔ میرے سامعین نے میری تقریر کی پہلی شق اور حدیث کی توجیہ کا انکار کیا اور یہ کہا کہ انبیاء کی حیات جسمانی (بعد ممات) نہ تو کسی کا عقیدہ ہے اور نہ ہی کسی کو یہ بات معقول نظر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ بعض محدثین اس طرف گئے ہیں اور متاخر احناف نے بھی یہ بات کھل کر بیان کی ہے۔ ان دوستوں نے میری بات کو جھٹلایا۔ میں نے کتاب پیش کی، انہوں نے استدلال مانگا۔ میں نے کہا: ناقل کے لیے نقل کی صحت ضروری ہے نہ کہ استدلال۔ البتہ جب میں استدلال پر آیا تو میرے ان دوستوں نے انکار حدیث کیا اور معتبر کتب احادیث کو بھی جھٹلایا۔ میں نے جب دیکھا کہ اس مجلس میں میری بات سننے والا کوئی نہیں تو مجھے شیخ سعدی کے جدال کی حکایت یاد آگئی (۳۰) اور میں

چپکے سے اپنے حجرے میں چلا آیا اور کہا:

ہمان یگانہ عصرم چو مقری تسبیح

چہ شد کہ خلق نیارند در شمار مرا

اس بات کو دو ہفتے گزر گئے تو ایک دوست میرے پاس آئے اور کہا کہ بعض طالب علم جو اس مسئلے کا انکار نہیں کرتے اور کوئی علمی تبحر بھی نہیں رکھتے، وہ چاہتے ہیں کہ آپ اس مسئلے پر فرقہ ثانیہ کے معتبر اقوال، دونوں مذاہب کی احادیث کی توجیہ اور اس مسئلے پر خود اپنی تحقیق فارسی زبان میں لکھیں تاکہ عامۃ الناس بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ناچار یہ چند سطریں حوالہ قلم کی جاتی ہیں۔“

اس کے بعد مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ انبیاء خدا کی سنت کے مطابق ایک دفعہ جسمانی اور طبعی موت سے ضرور دوچار ہوتے ہیں، لیکن ان کی روحیں انہیں لوٹا دی جاتی ہیں اور وہ حیات رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف نے حسب ذیل اکابر اور ان کی کتب سے اقوال نقل کیے ہیں۔

ابومنصور عبدالقادر بن طاہر بغدادی، بیہقی کی کتاب الاعتقاد سے، شیخ عقیف الدین یافعی، شیخ ابوالحسن شاذلی، ابونعیم کی دلائل النبوت سے، سہیلی کے رسالہ در مسئلہ حیات انبیاء بابدان در قبور سے، صاحب تلخیص، امام الحرمین، شہرستانی، تاج الدین السبکی شافعی کی شفاء الاسقام سے، شیخ جلال الدین سیوطی کی انموذج اللیب فی خصائص الحبیب سے، قرطبی کے تذکرہ سے، ملا علی قاری کی شرح حصن حصین سے اور افضل متأخرین محدث حنفی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوة، جذب القلوب، شرح مشکوٰۃ، مکتوبات اور رسالہ سلوک اقرب السبل سے۔

یہ سب نقل کرنے کے بعد بابا محمد عثمان نے اپنی رائے یوں دی ہے:

”باوجود صحیح احادیث اور اکابر کے اقوال کے، مناسب یہ ہے کہ ہم فرقہ اولیٰ (یعنی منکرین) کے کلام کی تاویل بھی اسی مفہوم اور معنی کے مطابق کریں۔ جہاں تک ممکن ہو اور اگر کسی کا فلسفہ میں غور و فکر کے بعد مزاج معتزلی ہو گیا ہے تو وہ بھی انکار محض نہیں کرتا، کم از کم حیات کا قائل ہو جاتا ہے البتہ اس کی کیفیت کو شارع کے علم سے مفوض سمجھتا ہے کما ہسی

المرتبه الادنى فى ساير الاحوال البرزخيه من العذاب الجسمانى والتنعيم الجسدانى وغيرها، ایسا نہیں ہے کہ یہ لوگ نصوص کو مجاز قرار دیتے ہیں۔ سبحان اللہ! لوگوں پر فلسفیت کس قدر غالب آچکی ہے، کیوں کہ یہ بات خود جب نصوص اور اجماع کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ یہ لوگ حیات بعد الموت کے قائل ہیں اور موت کی اصل کا انکار نہیں کرتے جس سے نص اور اجماع کی مخالفت ہوتی اور یہ امر ممکن ہے جس کی خبر مخبر صادقؑ نے دی ہے اور علمائے امت اس طرف گئے ہیں۔ پس انکار کیسا؟ واللہ اعلم بالصواب۔ فریقین کے مذہب کے مطابق حدیث ردّ روح کی بہترین تاویل یہ ہے کہ ردّ روح اشارہ ہے دراصل حضرت قدس کے شہود کے استغراق سے مقدس اور مطہر روح کے توجہ اور اقبال اور اس عالم کی طرف مشاہدہ ملاء اعلیٰ اور اس کے افاقت اور ادراک کے مراحل کی طرف۔ تاکہ تذاکر سلام اور اس کا جواب لوٹایا جانا میسر آ سکے۔ یعنی نبی کی روح پاک کو معنوی التفات، روحانی نزول اور بشریت کا اثر حاصل ہو جاتا ہے تاکہ اپنی امت کے سلام کا جواب دے سکے۔“

اس رسالے کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے: سپاس تقدس اساس حکیم روان آفرینی (را) کہ حلول روح پاک در حلہ خاک و نزول این جوہر لطیف در چنین منزل کثیف مانند آب نیسان در صدف قطرہ واریست۔

کشف المعانی: یہ رسالہ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد کے جزل کلیکشن (شمارہ NAP-46) میں محفوظ ہے۔ محرم ۱۱۷۶ھ کے اوائل میں بخط شکستہ تیرہ اوراق میں کتابت ہوا۔ نسخے کے آخری ملحقہ ورق پر ایک فارسی نعت درج ہوئی ہے جس میں تخلص ”معظم“ آیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے نسخہ فروش نے نسخہ کے ابتدا میں یہ نوٹ لکھا ہے کہ اس رسالے کا مصنف محمد معظم ہے اور یہ بابا محمد عثمان کشمیری کے رسالے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ لیکن مجھے نہ تو محمد معظم کا نام اور نہ ہی بابا محمد عثمان کشمیری کا نام اس کتاب میں ملا۔ نہ اس بات کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے ہو سکی۔ چونکہ ملحقہ نوٹ میں بابا محمد عثمان کشمیری کا نام آیا ہے اس لیے میں نے اس رسالے کا ذکر یہاں کرنا مناسب سمجھا۔

کشف المعانی دس فلسفیانہ اور عارفانہ سوالات کے جواب پر مشتمل ہے اور اس کا تعلق

حیات انبیاء بعد ممات سے نہیں ہے۔ (۳۱)

حواشی

- (۱) یہ غالباً نادر شاہ افشار کے دہلی پر حملے (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) کی طرف اشارہ ہے۔ (۲) فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، مرتبہ مع حواشی و تاملہ خورشید احمد خان، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، صدی ایڈیشن (۱۴۰۰ھ)، ص ۶۷۔
- (۳) رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ/نومبر ۱۹۱۴ء، بار دوم، ص ۲۵۵؛ نیز: مرتبہ و مترجمہ ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۵۹۱۔ (۴) حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار، مطبع سورج پرکاش، امرتسر، ۱۳۳۱ھ، ص ۲۵۷-۲۵۸۔ (۵) ایضاً، ص ۲۵۸۔ (۶) ایضاً، ص ۱۶۹-۱۷۰۔ (۷) ایضاً، ص ۱۹۶؛ رحمان علی، ص ۵۴۔ (۸) حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، ص ۲۲۹-۲۳۰؛ ۲۶۲؛ ۳۵۴-۳۵۵۔ (۹) ایضاً، ص ۲۴۴۔ (۱۰) فقیر محمد جہلمی، ص ۴۶۱؛ رحمان علی، ص ۲۷۵؛ حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، ص ۲۹۹۔ (۱۱) حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۰؛ رحمان علی، ص ۷۶۔
- سال پیدائش ۱۱۲۷ھ اور تاریخ وفات ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ اور فقیر محمد جہلمی، ص ۴۶۱ نے تاریخ وفات ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ لکھی ہے۔ (۱۲) حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۴-۳۰۵؛ فقیر محمد جہلمی، ص ۴۶۱؛ رحمان علی، ص ۱۷۰۔
- (۱۳) حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، ص ۲۹۶۔ (۱۴) ایضاً، ص ۲۲۷؛ فقیر محمد جہلمی، ص ۴۵۴؛ رحمان علی، ص ۱۵۲؛ کشمیر میں اسی نام کے ایک اور عالم دین بھی تھے۔ وہ ملا سلیمان کے شاگرد تھے اور ۳۰ شعبان ۱۲۲۰ھ کو وفات پائی۔
- دیکھیے: حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۵۔ (۱۵) حاجی محمد الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۱۔ (۱۶) ایضاً، ص ۷۳-۷۴؛ مسکین نے شیخ عبدالرحیم کوش محمد عابد سرہندی خلف شیخ عبدالاحد سرہندی کا مرید لکھا ہے، کتب انساب میں شیخ عبدالاحد (وحدت) سرہندی کے کسی فرزند کا نام محمد عابد نہیں ہے، یہاں غالباً ان سے سہواً ہے اور شیخ عبدالاحد (وحدت) سرہندی کے خلیفہ شیخ محمد عابد سنائی مراد ہے، اس طرف میری توجہ پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب نے دلائی ہے جس کے لیے ان کا سپاس گزار ہوں۔ (۱۷) قاضی مبارک گوپا منوی شارح سلم العلوم شیخ محمد دائم فاروقی کے فرزند تھے، علم منطق میں کامل تھے، ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں انتقال ہوا، رحمان علی، ص ۱۷۴، ۱۷۵، عبداللہ حسنی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامح والنواظر، مطبعہ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، ص ۲۴۷-۲۴۸، اختر راہی، تذکرہ مصنفین درس نظامی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱۳۹۸ھ

۱۹۷۸ء، ص ۲۳۸-۲۴۱۔ (۱۸) ہمارے پیش نظر رسالہ حیات انبیاء کے نسخہ میں ”ملا احمد اللہ“ ہی تحریر ہوا ہے، اگرچہ اس نام کے علماء بارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں گزرے ہیں جیسے مولوی احمد اللہ پانی پتی متوفی ۱۱۹۸ھ (رحمان علی، ص ۱۴) اور قاضی احمد اللہ بکرامی زندہ ۱۱۹۶ھ (رحمان علی، ص ۱۵)، لیکن یہ عمر میں بابا محمد عثمان سے کچھ چھوٹے تھے اور بابا صاحب کا ان سے تلمذ کرنا قرین قیاس نہیں ہے، میرے خیال میں یہ ملا احمد اللہ سندیلوی ہوں گے جو علم منطق کے شارح تھے اور بابا صاحب نے بھی ان سے کتب منطق پڑھنے کا ذکر کیا ہے، ”شرح تصدیقات سلم العلوم“ معروف بہ ”حمد اللہ“ ان کی مشہور تصنیف ہے، ۱۱۶۰ھ/۱۷۷۷ء میں دہلی میں وفات پائی، رحمان علی، ص ۵۲۔ (۱۹) میرزا ہد ہروی (م ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء) نے طلبہ کی سہولت کے لیے منطق کی متداول کتابوں پر حواشی لکھے، جیسے حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح تہذیب المنطق علامہ دوانی، حاشیہ رسالہ تصور و تصدیق قطب الدین رازی، زبید احمد رترجمہ شاہد حسین رزاقی، ص ۱۶۳، اختر راہی، ص ۲۳۴-۲۳۷۔ (۲۰) سلم العلوم منطق میں اور مسلم الثبوت اصول فقہ میں قاضی محبت اللہ بن عبدالشکور بہاری (م ۱۱۱۹ھ/۸-۱۷۰۷ء) کی تصانیف ہیں، رحمان علی، ص ۱۷۵-۱۷۶۔ (۲۱) لاہور میں ایک حنفی عالم دین قاضی محمد افضل لاہوری جو ابوتراب ابن نجیب الدین شیرازی کے شاگرد تھے، گزرے ہیں، ان کا انتقال ۱۰۹۲ھ میں ہوا، (عبدالحی حسنی، ج ۵، ص ۳۶۱)، یقیناً یہ ہمارے ممدوح کے اساتذہ میں سے نہ ہوں گے، کیوں ان کا زمانہ قدرے پہلے کا ہے۔ (۲۲) بابا محمد عثمان کشمیری نے اپنی تحریر میں لفظ ”نبایہ“ استعمال کیا ہے، اگر نبیرہ سے مراد راست یا پہلا پوتا ہے تو یہ زمانہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ان تین نبیروں (پوتوں) کا ہو سکتا ہے: شیخ نور اللہ بن شیخ نور الحق (۹۸۳ھ-۹ شوال ۱۰۷۳ھ) بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ابوالمفاخر بن شیخ علی محمد بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور محمد عاصم بن شیخ محمد ہاشم بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی، یہ سب اصحاب فضل و تصانیف سے تھے اور درس و تحقیق حدیث سے شغف رکھتے تھے، آگے ان کی اولاد بھی مثلاً شیخ سیف اللہ بن شیخ نور اللہ، حافظ محمد فخر الدین بن شیخ محبت اللہ بن شیخ نور اللہ اور شیخ الاسلام محمد بن حافظ فخر الدین کو بھی حدیث سے شغف تھا، شیخ الاسلام محمد، نادر شاہ کے حملہ (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) تک دہلی میں رہے اور صدر الصدور کی خدمات انجام دیتے رہے، خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، عکسی اشاعت مکتبہ رحمانیہ، لاہور، بلا تاریخ، ص ۲۴۶-۲۵۷۔ (۲۳) اس فہرست میں حجۃ اللہ البالغہ، لمعات، تأویل الاحادیث، عقد الجید، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، قول الجلیل اور ہمعات حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف ہیں۔ (۲۵) سکھ جیون کی کشمیر میں

کارپردازی کی مدت آٹھ سال اور چار ماہ (۱۱۶۸ھ تا ۱۱۷۵ھ / ۱۵۵۷ء تا ۱۵۶۲ء) ہے، نورالدین خان نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھر وادی تھی

در ہزار ویک صد و ہفتاد و پنج

سوکھ جیون شد تہہ با مال و گنج

دیکھیے: کرپارام، گلزار کشمیر، طبع ہند، ۱۸۷۱ء، ص ۲۳۳

(۲۶) احمد شاہ درانی نے ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء میں پنجاب پر حملہ کیا۔ (۲۷) بابا محمد عثمان کشمیری، رسالہ مسئلہ حیات انبیاء (فارسی)، قلمی، نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد، ذخیرہ مفتی، شمارہ: اسلام ۶۴۶، ورق ۸۶-۸۷۔ (۲۸) خود حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بھی بابا عثمان کشمیری کے نام متعدد خطوط موجود ہیں، جو تصوف کے اعلیٰ مضامین پر مشتمل ہیں، دیکھیے: نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، تحقیق و ترجمہ نسیم احمد فریدی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، ۱۹۹۸ء، جلد ۲، نیز: مکاتیب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، تحقیق مفتی نسیم احمد فریدی امرہوی، مقدمہ و تحشیہ ثار احمد فاروقی، کتابخانہ رضا رام پور، ۲۰۰۴ء، گیارہ خطوط بنام بابا عثمان۔ (۲۹) نسخے میں لفظ ”بکن“ پڑھا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی مطلب یہاں صحیح نہیں بیٹھتا۔ (۳۰) شیخ سعدی نے گلستان کے باب ہفتم در تائید شیر تربیت میں ایک طویل حکایت ”جدال سعدی بامدعی در بیان توانگری و درویشی“ لکھی ہے۔ (۳۱) Masood Ahmad Khan, *Descriptive Catalogue of Manuscripts*, Department of Archives, Government of Pakistan, Islamabad, 1974, p 14 احمد منزوی نے فہرست مشترک نسخہ های خطی فارسی پاکستان، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، جلد ۳، ص ۱۷۹ اور فہرستوارہ کتابهای فارسی، مرکز دائرہ المعارف بزرگ اسلامی، تہران، ۲۰۰۳ء، جلد ۷، ص ۵۴ میں مسعود احمد خان کی مذکورہ بالا فہرست کے حوالے سے کتاب کا نام ”کشف المعنی“ اور مصنف کا نام ”بابا محمد عثمانی“ لکھا ہے، یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، خود مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے: ”این اوراق کہ بہ کشف المعانی موسوم گشت“ (ورق ۲ الف) لہذا اس کا نام کشف المعانی ہی صحیح ہے، مسعود احمد خان نے بھی غالباً نسخہ فروش کی یادداشت کی مدد سے یہ بات لکھی ہے کہ یہ رسالہ بابا محمد عثمان کے رسالہ کے جواب میں ہے۔

ہندوستان میں فارسی مثنوی سرائی کا ایک اجمالی جائزہ

پروفیسر سید انوار احمد

ہندوستان میں مغلوں کے تسلط سے پہلے غزنویہ حکمرانوں اور سلاطین مملوک کے ادوار میں مثنوی سرائی کی طرف مائل شاعروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اس طویل عرصے میں جو سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے ایام سلطنت سے ابراہیم لودی کے دورہ سلطنت کو محیط ہے، بہت سارے باکمال شعراء منصبہ شہود پہ جلوہ گر ہوئے، لیکن ان کی شعر گوئی بیشتر قصیدہ، غزل، قطعات و رباعیات کی صنفوں پہ مشتمل ہے، تاہم مجموعی اعتبار سے ہندوستان میں مغلوں سے قبل کا یہ دور درخو توجہ ہے اور ادبی لحاظ سے قدر و اہمیت کا حامل ہے۔ شعر و سخن کے علاوہ اس عصر میں نثر نگاری کے مختلف شعبوں میں دانش مندوں نے نہایت گراں مایہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ خصوصیت سے تاریخ نویسی کی صنف میں ”تاج المآثر“ مولفہ حسن نظامی نیشاپوری، ”طبقات ناصری“ مصنفہ مولانا منہاج الدین عثمان، ”تاریخ فیروز شاہی“ تالیف ضیاء الدین برنی، ”فتوحات فیروز شاہی“ تصنیف شمس سراج عقیف جیسی وقیع و بیش بہا کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ یہ زمانہ فرہنگ نویسی، مکتوب نگاری اور آثار عرفانی کے لیے بھی نہایت ارزشمند ہے۔ فرہنگ قواس، لسان الشعراء، زفان گویا اور ”شرف نامہ منیری“ جیسے بیش قیمت لغات کی تصنیف کا تعلق اسی عہد سے ہے۔ حضرت ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری نے اسی زمانے میں ۴۷۰ھ میں اسلامی تصوف پہ اپنی مستند و معروف کتاب موسوم بہ ”کشف المحجوب“ لکھی۔ فخر مدبر کے دواہم نثری کارناموں ”آداب الحرب والشجاعة“ اور ”شجرۃ انساب“ کا بھی تعلق اسی دور سے ہے۔ حضرت مخدوم شیخ

مسکن کوٹھی، باقر گنج گولہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴، بہار۔

شرف الدین یحییٰ منیری کی مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی، شرح آداب المریدین، ارشاد السالکین، ارشاد الطالین، فوائد المریدین وغیرہ اسی عہد میں معرض تخلیق میں آئیں۔

بہر حال اس عہد کے معروف و معتبر شاعروں میں امیر خسرو اور حسن سبزی کے علاوہ مسعود سعد سلمان، نکتی لاہوری، ابو الفرج رونی، شہاب الدین مہرہ، فقیہ الدین، عصامی، بدر چاچ، شیخ بوعلی قلندر پانی پتی، سلطان احمد چرم پوش متوفی ۷۷۹ھ، مولانا مظفر بلخی متوفی ۷۸۸ھ، حضرت نوشہ توحید اور احمد لنگر دریا وغیرہ ہیں۔ لیکن مثنوی سرائی کے میدان میں امیر خسرو سے قطع نظر جو بلاشبہ شمار و معیار دونوں اعتبار سے اس میدان کا شہسوار یکہ تازہ ہے، کوئی مقتدر و عالی مقدار شاعر نظر نہیں آتا۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر نے متصوفانہ موضوع پہ ایک مختصر مثنوی موسوم بہ ”ہدایت و بشارت“ لکھی تھی۔ موصوف ایام شباب میں ہی عراق سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ کچھ دنوں دہلی میں اقامت کے بعد شہر پانی پت منتقل ہو گئے۔ اسی شہر میں ۷۲۲ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ شیخ کی یہ مثنوی اسرار تصوف کے شرح و بیان سے متعلق ہے۔ اس مثنوی پہ مولانا روم کے طرز تفکر اور شبیوہ بیان کا خاصا اثر ہے۔ مثنوی کے چند ابتدائی اشعار بشرح ذیل ہیں:

مرحبا ای بلبل باغ کہن از گل رعنا بگو باما سخن
مرحبا ای ہدہد فرخندہ فال مرحبا ای طوطی شکر مقال
مرحبا ای قاصد طیار ما می دہی ہر دم خبر از یار ما
اور اختتامیہ دو شعر اس طرح ہیں:

گر حرامت میکنی برخود حلال میکنی تسکین دلت با صد ملال

مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید و خلیفہ حضرت مولانا حسین نوشہ توحید متوفی ۸۴۴ھ جو سلسلہ فردوسیہ کے ایک بلند مرتبت صوفی اور مستند شاعر تھے نے بھی ایک مثنوی موسوم بہ ”افتخار حسین“ لکھی تھی۔ اس مثنوی میں ”قصہ چہار درویش“ کو منظوم کیا گیا ہے۔ حضرت نوشہ توحید کی یہ مثنوی ”مثنوی مولوی“ کے وزن میں ہے۔ داستان سرائی کے ساتھ جا بہ جا اس میں تصوف کے غوامض و نکات کی توضیحات بھی ملتی ہیں۔ عصامی جس کے احوال حیات تاریخی مآخذ

اور تذکروں میں نہیں ملتے، تغلق سلطنت کے عہد کا ایک ہنرور شاعر تھا، اس نے ”فتوح السلاطین“ نام کی ایک منظوم تاریخ لکھی تھی۔ یہ منظوم تاریخ جو ”شاہنامہ فردوسی“ کے وزن میں لکھی گئی ہے، ہندوستان کے غزنوی اور مملوک سلاطین کے تین سو پچاس سال کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے لے کر سلطان محمد بن تغلق کے حالات اس میں شامل ہیں۔ عصامی نے واقعات کی فراہمی میں بڑی دقت و تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ ”فتوح السلاطین“ بارہ ہزار ابیات پر مکتوی ہے۔ یہ مثنوی سلطان علاء الدین بہمن شاہ کی خدمت میں تقدیم کی گئی تھی۔ عصامی کو واقعات کی ترتیب میں بڑی مشقتیں اٹھانی پڑی تھی، جس کی بابت وہ بقرار ذیل اشارے کرتا ہے:

حدیثی کہ بشنیدم از باستان کشیدم بہ نظمش در ایں داستان
دگر آنچہ اندر کتب یافتم سراز درج آن نیز کم تا فتم
پراگندہ بس در قیست گراں کشیدم در ایں سلک چوں ناقدان
بہ تحقیق افسانہ ہای کہن بہردم بسی رنج در ہر سخن

مملوک سلاطین کے عہد کا جلیل القدر شاعر جو ہندوستان کا عظیم ترین شاعر محسوب کیا جاتا ہے دس مثنویوں کا خالق ہے۔ پانچ مثنویاں اس نے تاریخی موضوعات پر لکھیں اور دیگر پانچ مثنویاں خمسہ نظامی کی تقلید میں منظوم کیں۔ تاریخی مثنویوں میں قران السعدین، مفتاح الفتوح، دولرانی خضر خان، نئے سپہر اور تغلق نامہ ہیں جبکہ خمسہ خسروی کے عناوین اس طرح ہیں۔ مطلع الانوار، شیرین خسرو، مجنوں و لیلیٰ، آئینہ اسکندری اور ہشت بہشت، جو نظامی کی مثنویات موسوم بہ مخزن الاسرار، خسرو و شیرین، لیلیٰ و مجنوں، سکندر نامہ اور ہفت پیکر کے جواب میں لکھی گئیں۔ امیر خسرو بلاشبہ نظامی کا موفق ترین مقلد ہے۔ خمسہ نظامی اس کی تمام عمر کا سرمایہ ہے جبکہ امیر خسرو نے اپنے خمسہ کی ساری مثنویوں کو محض تین سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ خسرو کی تاریخی مثنویوں میں اولین مثنوی قران السعدین ہے جو سلطان بغراخان اور اس کے بیٹے کی قباد کی ایک دوسرے کے خلاف لشکر آرائی اور انجام کار دونوں کے درمیان مسالمت و مصالحت پر مکتوی ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ موضوع کے اعتبار سے بیزار کن اور ناخوش گوار ہے لیکن امیر خسرو نے

بزم و رزم کی واقعہ نگاری کے ذریعہ اس میں تفریح و نشاط کے عناصر کو منظوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ خسرو نے اسے مطبوع و مقبول بنانے کے لیے رقص و سرور کی محفلوں کے مناظر اور ضیافتوں کی مشروح و مفصل واقعات کی عکاسی کی ہے۔ دوسری مثنوی مفتاح الفتوح ہے جو ۶۹۰ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ مثنوی جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۶۹۵-۶۸۹ھ) کے جنگی معرکوں اور فتوحات کے وقائع پر مشتمل ہے۔ امیر خسرو کی تیسری تاریخی مثنوی دولرانی خضر خان ہے۔ اس مثنوی کا دوسرا نام عشقیہ بھی ہے۔ یہ خضر خان فرزند سلطان علاء الدین اور دیول دیوی دختر راجہ کرن والی گجرات کی عشقیہ داستان پر مبنی ہے۔ جب امیر خسرو نے اس مثنوی کو خضر خان کے نام تقدیم کیا تھا، اس وقت اس کی ابیات کی تعداد بیالیس سو تھی (۴۲۰۰) لیکن خضر خان کے قتل کے بعد امیر خسرو نے اس میں اضافے کیے اور ابیات کی تعداد چار ہزار پانچ سو انیس (۴۵۱۹) تک پہنچ گئی۔ امیر نے اس مثنوی کو ۷۱۵ھ میں انجام تک پہنچایا تھا۔ خسرو کی چوتھی تاریخی مثنوی ۷۲۰ھ میں مکمل ہوئی۔ قطب الدین مبارک شاہ خلجی (۷۱۶-۷۲۰ھ) نے اس مثنوی کو منظوم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ مثنوی ۷۱۸ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار چار سو نو ہے (۵۴۰۹)۔ ۷۲۰ھ میں سپہر نو حصوں پر مبنی ہے۔ ہر بخش کو سپہر کہا گیا ہے اور ہر سپہر کے لیے جدا گانہ بحر کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس مثنوی میں جنوبی ہند میں خسرو خان کی لشکر کشی کا ذکر ہے۔ یہ منظومہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ امیر خسرو نے اس میں ہندوستان کی ثقافت اور مراسم مذہبی کا شرح و تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

امیر خسرو کی آخری تاریخی مثنوی تعلق نامہ ہے۔ خسرو کی یہ مثنوی مکمل نہ ہو سکی تھی۔ مغل شاہنشاہ جہاں گیر کے عہد میں اس کی بازیافت ہوئی۔ بادشاہ کے حکم سے حیاتی گیلانی (متوفی ۱۰۱۵ھ) نے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مثنوی میں حیاتی گیلانی کے ایک سو انیس (۱۲۹) ابیات شامل ہیں۔

غزالی مشہدی معنی طراز و مبتکر شاعر تھا لیکن اپنے ملحدانہ خیالات اور غیر سنجیدہ مذہبی افکار و اظہارات کے سبب وہ اپنے ہم وطنوں کی شہرت و نفرت کا نشانہ بن گیا تھا۔ ساکنان مشہد اس درجہ اس سے منزجر و متوحش ہوئے کہ وہ ترک وطن پر مجبور ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے لیے عازم سفر ہوا اور دکن کے راستے کو طے کر کے جوینپور پہنچا۔ حاکم جوینپور خان زمان نے اس کے فضل و ہنر و

شاعرانہ قدرت واستعداد کی قدردانی کی۔ غزالی نے خان زمان کی مدح میں ”نقش بدیع“ نام کی مثنوی لکھی تھی۔ یہ مثنوی ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔ خان زمان نے ہر شعر کے عوض ایک اشرفی غزالی کو بخشش کے طور پر عطا کیا تھا۔ اس مثنوی کے کچھ اشعار بقرار ذیل ہیں:

خاک دل آروز کہ می بیختند شبنمی از عشق برو ریختند
دل کہ بہ آن رشحہ غم اندود شد بود کبابی کہ نمک سود شد
بی اثر مہر چہ آب و چہ گل بی نمک عشق چہ سنگ و چہ دل
خان زمان کی وفات کے بعد غزالی دربار اکبری سے وابستہ ہوا اور یہاں وہ ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ شاہان مغل کا یہ پہلا ملک الشعراء تھا۔ اس نے یہاں مراۃ الصفات نام کی مثنوی لکھی۔ اس مثنوی کے چند اشعار اس طرح ہیں:

تاج دہ تارک روئین تنان سرشکن گرز قوی گردناں دنان
شاہ فلک مسند و خورشید رشک ملک ستاینده و اقلیم بخش
گر بہ کشد تیغ جہان سوز را قطع کند سلک شب و روز را
نقش بدیع اور مراۃ الصفات کے علاوہ اس کی مثنویوں کی فہرست میں مشہد انوار، آئینہ خیال، واردات اور مواہب وغیرہ شامل ہیں۔ غزالی کی وفات ۹۸۰ھ میں ہوئی۔ دربار اکبری کا ملک الشعراء فیضی فیاضی نے بھی خمسہ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویوں کو نظم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس ہدف کی تحصیل میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی تھی۔ لیکن سرانجام مثنوی نل دمن کے سوا فیضی کی مثنوی کو مکمل نہیں کر سکا۔ نل دمن کو فیضی نے انچاس سال کی عمر میں مکمل کیا تھا۔ اس وقت اکبری بادشاہی کا انچالیسواں سال تھا۔ فیضی نے اس مثنوی کو لیلیٰ مجنوں کے جواب میں منظوم کیا تھا۔ یہ مثنوی چار ہزار دو سو ابیات پر حاوی ہے۔ اس کی داستان قدیم ہندوستان کی معروف رزمیہ کہانی ”مہا بھارت“ سے ماخوذ ہے۔ فصاحت و روانی اور فکر و اندیشہ کے اعتبار سے یہ ہندوستان میں لکھی گئی تمام مثنویوں میں افضل ہے۔ یہ مثنوی ہندوستان کی قدیم ثقافت و فرہنگ اور مذہب و روایت کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اس بنا پر شاہان مغل کے عہد میں یہ بے حد مقبول ہوئی۔ بدایونی فیضی سے بغض و عداوت رکھنے کے باوجود اس کے اس شعری کارنامے کی ستائش کرتا ہے۔ بدایونی اس

منظومے کی بابت اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے ”والحق مثنویست کہ در این سید سال
 مثل آن بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسی دیگر نگفتہ باشد“۔ فیضی کی نامکمل مثنویاں ”مرکز ادوار“،
 ”سیلمان بلقیس“، ”اکبر نامہ“ اور ”ہفت کشور“ ہیں جو نظامی کی مخزن الاسرار، شیریں خسرو، سکندر نامہ
 اور ہفت پیکر کے جواب میں لکھی جا رہی تھیں۔ محمد رضای نوعی جو شانی قریہ جو شانی من مضافات
 خراسان سے ترک وطن کر کے بادشاہ اکبر کے زمانہ سلطنت میں ہندوستان آیا اور شاہزادہ دانیال
 کی ملازمت سے وابستہ ہوا۔ شاہزادہ کی رفاقت میں وہ لاہور میں مقیم تھا جہاں اس نے ایک ہندو
 نوجوان کی لغش پہ اس کی زوجہ کے ستی ہونے کے واقعہ کو دیکھا تھا جس سے وہ بے حد ملول و متاثر
 ہوا۔ چنانچہ شاہزادہ موصوف کے ایما پر اس واقعہ کو مثنوی کی صورت میں منظوم کیا۔ یہ مثنوی مسمی بہ
 سوز و گداز بہت مقبول ہوئی۔ نوعی کی وفات ۱۰۱۹ھ میں برہان پور میں ہوئی۔ مثنوی ”سوز و گداز“
 کو پروفیسر امیر حسن عابدی نے مرتب کیا ہے اور برسوں پہلے بنیاد فرہنگ ایران سے اس کی
 اشاعت و طباعت ہوئی تھی۔ عہد جہاں گیر میں سعد اللہ مسیحا پانی پتی نے ہندوستان کے حماسی
 منظومہ رامائن کی بنیاد پہ ”رام سیتا“ نام کی مثنوی لکھی ہے جو شائستہ توجہ ہے۔ مسیحا پانی پتی ملاشیدا
 کے ہم صحبتوں میں تھا۔ اس مثنوی میں عفت سیتا سے اس کا درج ذیل شعر نہایت معنی خیز ہے:

تتش را پیرہن عریان ندیدہ چون جان اندرتن و تن جان ندیدہ
 مسیحا نے رامائن کو فارسی میں منظوم کرنے کے قصد سے بنارس میں رہ کر سنسکرت زبان
 سیکھی تھی۔ یہ مثنوی ۱۸۹۹ء میں نول کشور پریس سے چھپ چکی ہے۔ مسیحا کی رامائن اور دوسری
 منظوم فارسی رامائنوں پہ مکارم شعری کے لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے۔

اس مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

خداوند از جام عشق کن مست کہ در مستی فشانم در جہان دست
 مسیحا ہندو خواتین کی صفات بیان کرتا ہے:

زن است ومی کند کار جوان مرد کز و ہنگامہ پروانہ شد سرد
 بمردن عاشقان بی اختیار اند ولی معشوق اینجا جان سپارند
 ہی پنم بسی ہندی نژادان کہ خود را بر صنم سازند قربان

اس مثنوی میں ہفت سید المرسلین سے متعلق ایک شعر مطبوع خاص و عام ہوا ہے جو بقرار ذیل ہے:

دل از عشق محبت ریش دارم رقابت با خدای خویش دارم
جہاں گیر کے عہد حکومت میں گردھر داس نے بھی ایک فارسی رامائن منظوم کی تھی۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ثنا و شکر آن بخشندہ جان را پدید آورد کو ہر دو جہان را
اورنگ زیب کے عہد میں چند رمن بیدل پسر سری رام لاہوری نے نرگستان کے عنوان سے رامائن کو منظوم کیا تھا۔ اس مثنوی کی تکمیل ۱۱۰۵ھ میں ہوئی تھی۔ نرگستان چھ دفتروں پہ مشتمل ہے۔ پانچ دفتر بحر ہزج میں نظم کیے گئے اور چھٹے دفتر میں بحر متقارب کا استعمال اس بنا پر ہوا کہ جنگ کے ماجرا کو بیان کرنا تھا۔

امانت رائے امانت کی معروف رامائن بھی حایز اہمیت ہے۔ یہ ضخیم منظومہ تیس ہزار ابیات پہ محتوی ہے۔ اس مثنوی کو نظم کرنے میں پینتیس سال صرف ہوئے تھے۔
محمد اکرم غنیمت مشہور عشقیہ مثنوی ”نیرنگ عشق“ کا خالق ہے۔ غنیمت لاہور کے مضافات میں واقع قصبہ کنجاہ کا باشندہ تھا۔ میر محمد زمان راسخ کی خدمت میں اس نے مشق سخن کی تھی۔ غنیمت اپنی خداداد شعری لیاقت کے سبب اپنے معاصر شاعروں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس مثنوی کی داستان میرزا عبدالعزیز خلف والی سیال کوٹ کا ایک رقص امر دپسر پر فریفتہ ہو جانے سے متعلق ہے۔ اس مثنوی کے چند ابتدائی اشعار بقرار ذیل ہیں:

بنام شاہد نازک خیالان عزیز خاطر آشفته حالان
زمہش سینہ ہا جولان گہ برق دل ہر ذرہ در جوش انا الشرق
دل مستان عشق خود مقامش شکست رنگہا مہتاب بامش
اور خاتمہ کتاب بصورت زیرین ہے:

چو احوال عزیز نیک فرجام بدین صورت کہ گفتم یافت انجام
مرا آمد ز روی حسن ارشاد دو مصرع از کلام مولوی یاد

متاب از عشق رو گر چہ مجازیست کہ آن بہر حقیقت کار ساز نیست
 بیا ای ساقی میخانہ راز غنیمت کش نگاہی بر من انداز
 شرابی دہ کہ صورت بر گدازم بحسن لا یزالی عشق بازم
 ہندوستانی قصوں کی بنیاد پر جو فارسی مثنویاں لکھی گئیں ان میں عاقل خان رازی کی مہر و
 ماہ اور شمع و پروانہ نہایت جالب و دل انگیز ہیں۔ پہلی مثنوی منوہر اور موہد مالت کے قصے پہ مبنی
 ہے اور دوسری مثنوی راجہ رتن سن اور پدماوت کی داستان ہے، پدماوت کی کہانی کا نام رت پدم
 بھی ہے۔ اس قصے کو ملک محمد جاسسی نے اودھی زبان میں ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کے لیے لکھا تھا۔ ملا
 عبدالشکور پسر شیخ منور نے اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا۔ عاقل خان رازی سے قبل جہاں گیر
 کے زمانہ سلطنت میں بزمی گرجی ترک وطن کر کے ۱۰۲۸ھ میں گجرات آیا تھا۔ اس نے تین ہزار چودہ
 ابیات کے احاطے میں پدماوت کو منظوم کیا تھا۔ بزمی کی وفات آگرہ میں ۱۰۷۳ھ میں ہوئی۔
 بزمی کی مثنوی پدماوت کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

ای نام تو نقش لوح جانہا در ماندہ بوصف او زبانہا
 یہ مثنوی لکھنؤ سے ۱۸۴۲ء اور ۱۸۶۵ء میں منطبع ہو چکی ہے۔ عہد اورنگ زیب میں میر
 عسکری، عاقل خان رازی متوفی ۱۱۰۸ھ نے بھی پدماوت کو مثنوی کی صورت میں منتقل کیا۔ عاقل
 خان کے آبا و اجداد کا وطن خاف تھا لیکن اس کی زادگاہ ہندوستان ہے۔ وہ اورنگ زیب کے جلیل
 القدر امراء میں شمار ہوتا تھا۔ چہار ہزاری منصب سے سرفراز ہوا تھا۔ اور دار الخلافہ دہلی کی گورنری
 کے عہدے پہ بھی امتیاز و اقتدار کے ساتھ فائز رہا۔ عاقل خاں کی پدماوت حمد ایزد متعال و نعت
 سید المرسلین وغیرہ کے بعد اس طرح شروع ہوتی ہے:

قصہ پرداز ہندی افسانہ محرم راز شمع و پروانہ
 چون ازین قصہ دم کشید چو شمع شعلہ زد این چنین دمش در جمع
 کہ بہ ہند از شہان ہند و کیش بود شاہی بہ طالع درویش
 در شکل دیپ پاختنش بود کام دل در کنار بخشش بود
 مثنوی کے اختتامیہ اشعار اس طرح ہیں:

راز یا بس کن این حکایتها دم وزن دیگر از روایتها
 ما بر قسیم کس نخواهد ماند یادگاری دو سطر خواهد ماند
 ہر کہ ما را کند بہ نیکی یاد نام او در جہان بہ نیکی باد
 پدماوت کو کچھ اور شاعروں نے بھی منظوم کیا تھا۔ آنند رام مخلص نے اس داستان کو
 ”ہنگامہ عشق“ کے نام سے نظم کیا تھا۔ پھر رای گو بند نشی نے تحفۃ القلوب کے عنوان سے اسے
 مثنوی کی صورت دی۔ ان کے علاوہ حسین غزنوی اور حسام الدین نے بھی اس عشقیہ افسانے کو
 منظوم کیا تھا۔ دربار شاہجہانی کا خوش فکر شاعر میرزا ابوطالب کلیم ہمدانی جو سبک ہندی کے
 شعرائے عظام میں شمار ہوتا ہے نے بھی ایک مثنوی بعنوان ”پادشاہ نامہ“ لکھی ہے۔ کلیم کی یہ
 مثنوی شاہجہاں کے شاہانہ جاہ و جلال، اس کی حکومت کے استحکام و انتظام اور اس کی عسکری و
 اجتماعی کامیابیوں سے متعلق ہے۔ یہ مثنوی مرحلہ تکمیل کو ابھی نہیں پہنچ سکی تھی کہ ۱۰۶۲ھ میں اس
 کا انتقال ہو گیا، مثنوی کا ابتدائیہ شعر حسب ذیل ہے:

بنام خدائی کہ از شوق جود دو عالم عطا کرد و سایل نبود
 اور مثنوی اس شعر پہ ختم ہوتی ہے:

چو اقبال ایں شاہ گردون سریر نیند دگر در جہاں قلعہ گیر
 عہد شاہجہانی کا معروف شاعر ابوالبرکات منیر لاہوری متوفی ۱۰۵۴ھ بھی متعدد مختصر
 مثنویوں کا خالق ہے۔ مثلاً آب و رنگ بتوصیف باغات اکبر آباد، درد و الم در تشریح عشق اور ”در
 صفت بنگالہ“ وغیرہ آخر الذکر مثنوی شعری محاسن کے ساتھ علمی افادیت بھی رکھتی ہے۔ منیر نے
 اس مثنوی میں بنگالہ کی آب و ہوا موسمی تحولات کے زیر اثر کیف و حال، باد و باران، سبزہ زار اور
 وہاں کی ندیوں کے تلاطم و طغیانی کو شاعرانہ ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثنوی میں بنگالہ
 کے وحش و طیور کا بھی بیان ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بنام فیض بخش آتش آموز کہ دلہا گشتہ از وی فیض اندوز
 بدرگاہش خرد جستہ تو سل ز فیض گشتہ انسان مظہر کل
 اور خاتمہ کے اشعار بطور ذیل ہیں:

منیری جنبہ افروز معانی دلت ماہ سپہر نکتہ دانی
 سخن را نیست پایانی بہ ہش باش نمش باش و نمش باش
 نورالدین محمد ظہوری تیشیزی (متوفی ۱۰۲۵ھ) ۹۸۸ھ میں ہندوستان آیا۔ دکن پہنچ کر وہ عادل شاہ کے دربار سے وابستہ ہوا۔ ساقی نامہ کی صورت میں ایک مثنوی احمد نگر کے والی برہان شاہ کی مدح میں لکھی۔ اس کے عوض میں بادشاہ نے سوزنجیر ہاتھی، درہم و دینار، نفیس ملبوسات ظہوری کو بطور صلہ و انعام مرحمت کیا۔ اس مثنوی میں پینتالیس سو (۲۵۰۰) ابیات ہیں۔ ساقی نامہ ۱۸۴۹ء میں مطبع نول کشور سے چھپ چکا ہے۔

ہیرو رانجھا کی داستان محبت جس کا تعلق خطہ پنجاب سے ہے ہندوستان کی رقت انگیز داستانوں میں سے ایک ہے۔ فارسی زبان میں بشمول آفرین لاہوری متعدد شاعروں نے اس عشقیہ کہانی کو منظوم کیا ہے۔ اس قصہ کو فارسی میں مثنوی کی شکل دینے والا اولین شاعر سعید سعیدی تھا۔ مثنوی کے آغاز میں وہ کہتا ہے یہ داستان ہندی کا جامہ کہن پہنے ہوئے تھی، میں نے اسے حلہ نو میں ملبوس کیا۔، کہتا ہے:

در جامہ کہنہ بود عریاں در ہندی ہی نمود عریاں
 پیراہن نو بنظم گفتار پوشیدہ ز بندہ ہیر دلدار
 سعیدی کے علاوہ ایک دوسرے شاعر بہ متخلص بہ چنابی نے بھی اس افسانے کو منظوم کیا تھا۔ اس کی مثنوی کا نام ہیر و ماہی ہے۔ اپنی مثنوی کی بابت اس طرح اظہار خیال کرتا ہے:

ایں قصہ ہمہ تمام کردم شاداں دل خاص و عام کردم
 آرایش نظم دارم او را بر کرسی زر نہادم او را
 ممتاز بہ فارسیش کردم آزاد ز ہندویش کردم
 کنہیا لعل متخلص بہ ہندی نے بھی ہیرو رانجھا کی کہانی کو منظوم کیا تھا۔ اس کی مثنوی کا عنوان ”نگارین نامہ“ ہے۔ ہیرو رانجھا کو فارسی میں منظوم کرنے والے اور دوسرے شاعروں میں میر قمر الدین منت، محمد عاشق متخلص بہ لائق ہیں لیکن ان تمام مثنویوں میں فقیر اللہ آفرین کی مثنوی مسمی بہ ”ناز و نیاز“ سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ آفرین کی مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

بنام چمن ساز ناز و نیاز کہ خار نیازش بود سر و ناز

اور مثنوی کا آخری شعر اس طرح ہے:

گلستان کن صبح و شام توئی چمن ساز عیش مدام توئی

آفرین کا وطن لاہور تھا۔ وہ ایک آزاد طبع شاعر تھا۔ اپنے اوقات بیشتر قہوہ خانوں میں گزارتا تھا۔ اس کی وفات ۱۱۵۴ھ میں ہوئی۔ یہ مثنوی فرخ سیر کے زمانہ سلطنت میں مکمل ہوئی تھی۔ عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (متوفی ۱۱۳۰ھ) صنف غزل میں انفرادی طرز تفکر کا شاعر محسوب ہوتا ہے۔ اس کی غزلوں کے مختصات میں نزاکتہائے معنی، اشکالات و تلویحات اور نہایت لطیف و دقیق خیال بافیاں شامل ہیں۔ اس نے سبک ہندی کے مشخص عناصر کو منتہا کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن غزلوں کے علاوہ اس نے صنف مثنوی میں بھی نہایت شائستہ توجہ تجر بے کیے۔ بیدل چار مثنویوں کا خالق ہے۔ ”محیط اعظم“ بیدل کی پہلی مثنوی ہے جو قریباً دو ہزار ابیات پہ حاوی ہے۔ شاہنامہ فردوسی کی بحر میں لکھی گئی اس مثنوی میں آٹھ ابواب ہیں۔ اس کا موضوع الہیات ہے اور تصوف کے معروف نظریہ وحدت الوجود کے مطالب کو بیان کرتی ہے۔ بیدل کی دوسری مثنوی موسوم بہ ”طلسم حیرت“ ہے۔ چار ہزار ابیات پہ مشتمل یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ”شیرین خسرو“ کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کے مدعا و مفہوم کا تعلق بھی مسائل الہیات سے ہے۔ تصوف کے رموز و نکات کے شرح و توضیح کے مقصد سے یہ مثنوی معرض نگارش میں آئی ہے۔ بیدل کی تیسری مثنوی مسمیٰ بہ ”طور معرفت“ میں ایک ہزار تین سو ابیات شامل ہیں۔ اس مثنوی کو نظم کرنے کے زمانے میں بیدل میوات میں نواب شکر اللہ کا مہمان تھا۔ مثنوی خطہ میوات کے کوہستانی مناظر کو بیان کرتی ہے۔ بیدل نے اسے محض دور و زکی مدت میں نظم کیا تھا۔ بیدل کی آخری مثنوی بعنوان ”عرفان“ ہے۔ سنائی کی مثنوی ”حقیقۃ الحقیقت“ کے وزن میں (فاعلاتن مفاعلن فعلن) لکھی گئی اس مثنوی میں خدا، انسان اور جہان کے رشتہ و پیوند کو بیان کیا گیا ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ بیدل نے اس مثنوی کو تین سال کی مدت میں مکمل کیا تھا۔

فرخ سیر کے دورہ سلطنت میں میر محمد شریف الحسنی رے سے مہاجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ وہ ایک مستند و معتبر شاعر ہے، اس کے کلیات کا قلمی نسخہ کتاب خانہ خدابخش میں تحت شمارہ

فہرست ۳۹۸ موجود ہے۔ اس کلیات میں ایک مختصر عشقیہ مثنوی شامل ہے جس کا عنوان بقرار ذیل ہے ”عاشق شدن یعقوب علی خان منگ باشی بر صیغہ بیگم کہ در قریہ برم پوری بہم رسانیدہ بود“۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

شنوا فسانہ ای در عشق بازی کہ آوردم بنظم از بی نیازی
رفیق و ہم جلیسم بود مردی حریفی مرد رندی اہل دردی
مثنوی کا اختتام اس طور ہے:

توئی عاشق توئی معشوق عالم توئی عزت دہ اولاد عالم
توئی روزی رسانِ جملہ مخلوق توئی عاشق توئی خلاق معشوق
بلطفی کن حسینی را سرافراز کہ گردد در جہانی عشق ممتاز

شمس الدین فقیر ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری کا ایک باکمال شاعر تھا۔ علی قلی والہ داغستانی سے اس کے بڑے گہرے روابط تھے۔ فقیر شاہجہاں آباد میں ۱۱۱۵ھ میں متولد ہوا۔ اس کی وفات ناگہانی طور سمندر میں اس کشتی کے غرق ہو جانے کے سبب ہوئی جس سے وہ زیارت خانہ خدا کے بعد وہ لوٹ رہا تھا۔ فقیر نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں اور اس صنف میں وہ منفرد مقام رکھتا ہے۔ ”در مکنون“ فقیر کی اہم ترین مثنوی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

خداوندا رہ تفرید بنما بروی من در توحید بگشا
از آں را ہم بربرتا کوی مقصود وزاں در جلوہ گر کن روی مقصود
در دل بر رخم از لطف بکشای وز آں پس از درم ناگہ درون آی

یہ مثنوی دوازدہ امام کے مناقب اور برجیں خاتون ملقب بہ ملیکہ بنت قیصر روم کی دل پذیر کہانی اور اس کا امام محمد حسن عسکریؑ کے حوالہ از دواج میں آنے کے ماجرا کو بیان کرتی ہے۔ خاتمہ کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بجہ اللہ کہ این در گرامی گرفت از کلک من نظم تمامی
بنام من ز دیوان ارادت مسجل گشت توقع سعادت
ز بحر دل چو جو شیدا من لالی خطابش در مکنون گشت حالی

فقیر کی ایک دوسری موسوم بہ ”تصویرِ محبت“ ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں ایک تنبول فروش کے بیٹے رام چندر کی عشقیہ داستان کو بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کے اشعار کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود فقیر کو تنبول فروش کے اس بیٹے سے عشق ہو گیا تھا۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

خداوند دلی دہ شعلہ سامنم کہ از سوزش فند آتش بجانم
فقیر کی مثنوی ”والہ و سلطان“ والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کے عشق کی رقت انگیز داستان کو بیان کرتی ہے۔ والہ کو اپنے عم زاد بہن سے عشق ہو گیا تھا۔ ایام طفلی میں ہی دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے دونوں کی عروسی انجام پذیر نہیں ہو سکی۔ ناکام محبت کی اس داستان کو فقیر نے منظوم کیا ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد تین ہزار دوسو تیس (۳۲۳۰) ہے۔ مثنوی کی خصوصیت کی بابت فقیر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

ایں نظم ز نظمہای دیگر از چند جہت بود نکوتر
اولی آنست کہ ایں حکایت منقول نکشتہ از روایت
نہ بود چو حکایتی سماعی یا ہجو فسانہ اختراعی
تقویم کہ شدہ است اکنون شور فرہاد و عشق مجنون
آں بہ کہ رہ ز رفتہ پوم حرفی کہ بود نغفہ پویم
لیلی نہ بہ از خدیجہ سلطان مجنون نہ بہ از علی قلی خاں
فقیر کی ایک مثنوی بعنوان ”شمس الضحیٰ“ عرفان و تصوف کے موضوع پر ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ای بہ نامت زبان سحر طراز نطق را دادہ مایہ اعجاز
اس مثنوی میں ائمہ دوازہ کے کرامات و خارق العادہ کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطالب معتبر منابع سے اخذ کیے گئے ہیں۔ مثلاً ساتویں امام موسیٰ بن جعفر کی غیر معمولی فضیلتوں کی توصیف محمد بن علی بابویہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ ابو جعفر محمد بن علی بابویہ شیعوں کے بزرگ فقیہ تھے۔ یہ مثنوی ۱۱۷۳ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ فقیر نے ایک مثنوی بعنوان ”مثنوی در

واقعہ جان سوز کر بلا، لکھی تھی۔ اس مثنوی میں کر بلا کے اندوہ ناک فاجعہ کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی نے ایک مثنوی مسمیٰ بہ ”بشارت الامامت“، لکھی تھی۔ اس مثنوی میں طباطبائی نے اپنے بزرگوں کے ماورائے طبعی کرامتوں کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

بنام خدا یکہ جان آفرید زمین آفرید و زمان آفرید
کتاب خانہ خدا بخش میں اس مثنوی کا قلمی نسخہ فہرست شمار ۱۹۹۱ کے تحت موجود ہے۔
یہ نسخہ ۶۹- اوراق پہ محتوی ہے۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی شورش و سرکشی کی بابت ایک عیسائی بنام فراسو نے ایک مثنوی بعنوان فتح نامہ انگریز لکھی تھی۔ مصنف اس وقت کے وقائع و حوادث کا چشم دید شاہد تھا۔ یہ مثنوی مخطوطہ کی صورت میں کتاب خانہ خدا بخش میں فہرست شمار ۱۹۳۹ کے تحت محفوظ ہے۔ مثنوی ایک سو پانچ اوراق پہ حاوی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

در نظم سقتم بنام خدای کریم و رحیم است وہم رہنمای
میر فرزند علی موزون کا وطن سامانہ تھا۔ فن شاعری میں میر شمس الدین فقیر کا تلمیذ تھا۔ وہ تیرہویں صدی ہجری کے اوایل میں اودھ کا ایک ذولسانین شاعر تھا۔ اس کے اشعار فارسی و اردو دونوں زبانوں میں ملتے ہیں۔ بڑا کثیر الکلام اور شیریں گفتار شاعر تھا۔ اس کی وفات لکھنؤ میں ۱۲۲۹ھ میں ہوئی۔ اس نے ایک تاریخی مثنوی موسوم بہ ”آصف نامہ“ لکھی تھی۔ موزون نے اس مثنوی میں معرکہ جنگ مابین آصف الدولہ سربراہ مملکت اودھ اور غلام محمد خان سربراہ قوم روہیلہ کو منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی کا قلمی نسخہ بخط مصنف پنچانوے صفحات پہ مشتمل کتاب خانہ خدا بخش کا مملوکہ ہے۔ جس کا سلسلہ وار نمبر ۲۶۷۱ ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بنام خداوند رب العباد کہ ملک سلیمان بہ آصف بداد
اور اس شعر پہ مثنوی انجام پذیر ہوتی ہے:
ز تیغش دل خصم او چاک باد سر دشمنش زیب فتراک باد
یہ مثنوی ۱۹۶۲ء میں ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ سے اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

اورنگ زیب کے عہد کا معروف شاعر ملا بینش کشمیری بھی کئی مثنویوں کا مصنف ہے۔ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ”کلیات بینش“ کے قلمی نسخے میں بینش کی پانچ مثنویاں ہیں جبکہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے کتاب خانہ میں جو مثنویات بینش کا نسخہ ہے اس میں چھ مثنویاں شامل ہیں۔ اس مخطوطے کا فہرست نمبر ۱۰۹۴ ہے۔ بینش کی مثنویوں کے نام اس طرح ہیں: بینش ابصار، گنج روان، گلدستہ شور خیال، رشتہ گوہر اور جواہر خانہ۔

بینش کشمیری کے مندرجہ بالا تمام مثنویوں میں ”شور خیال“ شعری محاسن کے اعتبار سے زیادہ درخور توجہ ہے۔ یہ مثنوی بنارس کی ایک عشقیہ داستان کو بیان کرتی ہے۔ آغاز میں شہر بنارس کی خوشگوار فضا، وہاں کی دوشیزگان، دلربا، فرح بخش مناظر و مظاہر کو منظوم کیا گیا ہے، پھر ایک مسلم نوجوان اور ایک ہندو دوشیزہ کی عشقیہ کہانی ہے جو ایک دن ساتھ غسل کرتے ہوئے دریا کے گرداب میں پھنس کر غرق ہو جاتے ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی چند اشعار اس طرح ہیں:

خداوندا ز شور دل خرابم نمک پروردہ چو مرغ کبابم

بنارس را عجب آب و هوا یست برای عشق بازی طرفہ جالیست

آرزو اکبر آبادی ایک مستند و محکم نثر نگار ہونے کے باوصف ایک مسلم الثبوت شاعر بھی تھے۔ ان کی مثنوی ”جوش و خروش“ شہرت رکھتی ہے جو نوعی خوشامیابی کی مثنوی ”سوز و گداز“ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ان کی ایک دوسری مثنوی کا نام ”مہر و ماہ“ ہے۔ ان کے علاوہ ایک مثنوی مسمیٰ بہ حسن و عشق زلالی کی مثنوی ”محمود و ایاز“ کے جواب میں لکھی گئی۔ آرزو کی وفات ۱۱۶۹ھ میں ہوئی۔

کشمیر میں چک سلاطین کا عہد ہندوستان میں مغلیہ بادشاہوں کا ہم زمان رہا ہے۔ ۲۷ سال کی مدت سلطنت میں ناموافق سیاسی اوضاع کے باوجود اس دور میں فارسی شعر و ادب کو فروغ ہوتا رہا۔ اس زمانے کے معروف شاعر شیخ یعقوب صرف نے نظامی گنجوی کی تقلید میں ”مسک الاخیار“، ”واثق و عذرا“، ”مغازی النبی“، ”لیلیٰ مجنوں“ اور ”مقامات مرشد“ نام کی پانچ مثنویاں تصنیف کیں۔ اکبر کے زمانے میں کشمیر سلطنت مغلیہ کا حصہ بن گیا۔ مغلیہ دور میں فارسی شعر و ادب کی پیش رفت میں مزید تیزی آئی۔ شیخ محمد چشتی نے تصوف کے موضوع پر ایک مثنوی

”کنز العشق“ لکھی تھی۔ میرزا کمال الدین بیگ خان کامل بدخشی نے ایک مثنوی بنام ”بحر العرفان“ لکھی تھی جو چار جلدوں میں اسی ہزار اشعار پہ مشتمل ایک عارفانہ مثنوی ہے۔ افغانی دور کے کشمیری مثنوی نگاروں میں سعد اللہ شاہ آبادی سب سے زیادہ معروف ہے۔ اس نے ”باغ سلیمان“ نام کی مثنوی میں حکام شہر کے جور و ظلم کو بیان کیا ہے۔ ملا اشرف بلبل نے خمسہ تصنیف کیا ہے جو درج ذیل مثنویوں پہ مشتمل ہے۔ رضانا مہ، ہشت اسرار، ہشت بہشت، مہر و ماہ اور ہیمال ناگرائے ہیمال و ناگرائے دو کشمیری عاشق و معشوق تھے۔ افغانی حکومت کے دور میں شیخ محمد رفیعی نے ”تحفۃ الاحباب“ اور ”مصباح الدجا“ نام کی دو مثنویاں لکھی تھیں جن کے موضوعات پند و مواعظ سے متعلق ہیں۔

سید محمد خورشید امامی بلگرامی پسر افتخار الدین ذرہ شہر آ رہ کے مضافات میں واقع قصبہ کوت میں ۱۲۱۲ھ میں متولد ہوا تھا۔ امامی بلگرامی تیرہویں صدی ہجری کے نیمہ اول میں ایالت بہار کا ایک مستند اور ارجمند شاعر محسوب ہوتا تھا۔ اس کی وفات ۱۲۷۲ھ میں ہوئی۔ امامی دو مثنویوں کا خالق ہے۔ اس کی پہلی مثنوی موسوم بہ ”شورش عشق“ ۱۲۲۳ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ یہ مثنوی تقریباً پانچ سو پچاس ابیات پر محتوی ہے۔ اس الم خیز و شور انگیز مثنوی کی اساس ادیب عرب اصمعی کی روایت کردہ ایک عاشقانہ داستان پر ہے۔ آغاز مثنوی میں امامی اشارہ کرتا ہے:

عرب را سحر سازی اصمعی نام فصاحت را ز نامش شہود در کام
بدیسان گفت حرفی غارت ہوش کز و در بحر اشکم غرق تا گوش
حمد، نعت اور منقبت کے بعد مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

بیا ای خامہ شیرین ز بانم بیا ای طوطی ہندوستانم
ہوی ہند دوات خولیش روکن و زان سرچشمہ معنی وضو کن
امامی سے قبل شیخ علی حزیں نے اس داستان کو منظوم کیا تھا جس کا ذکر شیخ کے ”تذکرۃ

الاحوال“ میں موجود ہے۔ اختتامیہ کے اشعار بشرح ذیل ہیں:

چون این افسانہ آرد شورش عشق نہادم نام آن را شورش عشق
برایش گوہر تاریخ سقتم بود ملک در خوشاب گفتم

۱۲۹۲ھ میں یہ مثنوی مطبع نور الانوار (آرہ) سے اردو کے معروف شاعر صغیر بلگرامی کے تحت اہتمام اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

امامی بلگرامی کی دوسری مثنوی بنام ”ثمر مراد“ ایک ہزار نو سوا بیات پر مشتمل ہے۔ امامی کا یہ ایک طربہ منظومہ ہے جو ۱۲۴۸ھ میں انجام پذیر ہوا تھا۔ اس مثنوی کی تاریخ اتمام سے متعلق کئی شاعروں نے قطعات لکھے تھے۔ انور علی یاس آروی نے اس کی تاریخ تکمیل ”طاقت خامہ امامی“ اور ”باغ مراد“ جیسے کلمات سے نکالی ہے۔ مثنوی کا افتتاحیہ اس طرح ہے:

لوا یم خامہ و لفظ است لشکر بہ میدان آدم اللہ اکبر

بدست طبع قوس زور بازو خدنگ خامہ از کاغذ ترازو

اردو کے معروف شاعر صغیر بلگرامی اپنے تذکرہ موسوم بہ ”جلوہ خضر“ میں لکھتے ہیں کہ امامی کی مثنوی ”ثمر مراد“ کا مرتبہ غنیمت کنجاہی کے ”نیرنگ عشق“ سے بلند تر ہے، یہ مثنوی ۱۱۹۲ھ میں مطبع نور الانوار آرہ سے چھپ چکی ہے۔

راجہ پیارے لعل الفتی پسر رای سکھن لعل کا یتھ فارسی کا ایک برجستہ صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت عظیم آباد میں ہوئی تھی۔ سن شعور کو پہنچنے پر الفتی اکبر شاہ ثانی اور شاہ عالم کے ایام حکومت میں شاہجہاں آباد میں دیوانی کی خدمات پہ مامور تھا۔ دہلی کے ایام ملازمت کی مدت کو الفتی نے بڑے عزت و احترام کے ساتھ گزارا لیکن مدد چشم کی بیماری کے سبب اسے ملازمت ترک کر کے عظیم آباد لوٹنا پڑا، یہاں پچاس ہندو مسلمان طلباء اس کے حلقہ تدریس میں داخل تھے۔ اس کے تلامذہ میں سب سے زیادہ شہرت وزیر علی عبرتی کو حاصل ہوئی۔ الفتی کا دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس نے ”نیرنگ تقدیر“ نام کی ایک مثنوی لکھی تھی جو اس وقت ارباب شعر و ادب کے درمیان بہت مقبول ہوئی تھی۔ یہ مثنوی ۱۲۹۸ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ الفتی کی وفات ۱۲۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ ”نیرنگ تقدیر“ ایک عشقیہ مثنوی ہے جو تقریباً چھیس سوا بیات پر مثنوی ہے۔ مثنوی کی ابتدا احمد ایزدشعال سے اس طرح ہوتی ہے:

بیمار غمت نجوم افلاک افتادہ بہ طاق چشم ادراک

نہ چرخ بہ کنہ تو ز آغاز سرگشته چو گوی در تگ و تاز
 ناخن بہ جگر ہلال از تو خواہندہ ہر کمال از تو
 یہ مثنوی خطہ باختہ کے ایک امیر کی اکلوتی خوب رو دختر کی عشقیہ کہانی کو بیان کرتی ہے جس کا رشتہ مناکحت صغریٰ میں ہی قبیلہ کے ایک پسر نیکو چہرے باندھ دیا گیا تھا۔ الفتی نے نیرنگ تقدیر کے علاوہ چند مختصر مثنویات بھی منظوم کی ہیں۔ مثلاً مثنوی موسوم بہ ”طلائی دست افشار“ جو ایک سو پچپن ابیات پہ حاوی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتاب خانہ خدابخش میں فہرست نمبر ۳۶۱۰ کے تحت موجود ہے۔ الفتی نے اس مثنوی میں ایک تیز و طرار زن بیوی کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی نظامی کی ”مخزن الاسرار“ کے وزن میں منظوم ہوئی ہے، حمد باری تعالیٰ کے بعد مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے:

بیوہ زنی بود یکی تیز ہوش چابک و شیرین لبت و لہو کوش
 برق نہ برقع ابر سیاہ در تہق ابر سیہ شرق ماہ
 شوخ تر از زنگس سہشلائی خویش در پی رسوائی شیدای خویش
 الفتی کی ایک دوسری مختصر مثنوی بعنوان ”شکنج خرد“ احتراز صحبت با زنان کے موضوع پہ لکھی گئی ہے۔ اس میں عجم کے ایک بادشاہ کی داستان اور اس کے وزیر کے پند و نصیحت کو بیان کیا گیا ہے۔ چودہ صفحات پہ لکھی گئی مثنوی حمد و نعت کے بعد اس طرح شروع ہوتی ہے:

بد یکی از پادشاہان عجم صاحب خیل و خول ہم جب جم
 رفتہ از خود در ہوای چشم رگوش خوردہ از دست ہوس صہبای نوش
 بستہ زنجیر کا کل جان و دل در ہوای سر و نازی پا بہ گل
 اس مثنوی کا قلمی نسخہ فہرست نمبر ۳۶۱۱ کے تحت کتاب خانہ خدابخش میں موجود ہے۔

افتی کی تیسری مختصر مثنوی مسمیٰ بہ ”ابر“ ہے۔ یہ مثنوی ۱۵۲ ابیات پہ مشتمل ہے اور بارہ صفحات میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بعد حمد خالق ارض و سما گویمت نغزک مقال غم زدا
 بود قاضی بر سر دستار خوان ناگہانی بگذشت رند نوجوان

کتاب خدا بخش میں اس مثنوی کا مخطوطہ نسخہ فہرست نمبر ۳۶۱۲ کے تحت موجود ہے۔
 شاہ امین احمد فردوسی متخلص بہ ثبات ۱۲۲۸ھ میں بہار شریف میں متولد ہوئے تھے۔
 خوش فکر شاعر تھے اور عرفان و تصوف کے انوار و اشراق کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی غیر معمولی
 قدرت رکھتے تھے۔ ان کی وفات ۷۲ سال کی عمر میں ۱۳۲۱ھ میں ہوئی۔ حضرت ثبات متعدد
 مثنویوں کے مصنف ہیں۔ ”گل فردوس“ ثبات کی طویل ترین مثنوی ہے۔ یہ مثنوی مطبع نول کشور
 سے ۱۳۰۱ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ حضرت ثبات نے اس مثنوی میں سلسلہ فردوسیہ کے اولیاء و مشائخ
 کی منقبتیں بیان کی ہیں۔ اشعار کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔ مثنوی بحر مل کے فاعلاتن فعلاتن
 فعلاتن فعلن کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ ابتدائیہ شعر اس طرح ہے:

دانداز معرفت آنکس کہ دل آگاہ بود اینکہ در ارض و سوات یک اللہ بود

شاہ ثبات کی دوسری مثنوی مسمی بہ ”گل بہشتی“ میں میرنجات اصفہانی کی مثنوی ”گل
 کشتی“ کے فنی اسلوب کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے یہ مثنوی ”گل کشتی“ سے مختلف
 ہے۔ اس کا موضوع یکسر متصوفانہ ہے۔ یہ مثنوی بھی لکھنؤ کے مطبع انوار محمدی سے چھپ چکی ہے
 جو ۲۲۲ صفحات پہ حاوی ہے۔ اس مثنوی میں معروف و بلند مرتبت صوفیوں کے مدائح و مناقب
 بیان ہوئے ہیں۔ جن میں چند نام اس طرح ہیں، حضرت ابوالعلا، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ
 بختیار کاکی اور خواجہ فرید الدین گنج شکر وغیرہ۔ مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

از ہمہ راہ رہ فقر چہ دل خواہ بود زانکہ الفقر اذا تم ہو اللہ بود

مثنوی میں اشعار کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔

شاہ ثبات کی مثنوی ”روضۃ النعیم“ کا سال طباعت ۱۳۰۱ھ ہے۔ یہ مثنوی مطبع اشرف
 الاخبار بہار شریف سے طبع ہوئی تھی۔ اس مثنوی میں بھی شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کے علاوہ
 چند دوسرے جلیل القدر صوفیہ کی خدمت میں منقبتیں پیش کی گئی ہیں۔ چند اشعار حضرت غوث
 الاعظم کی منقبت سے اس طرح ہیں:

حضرت شیخ جہاں سید عبد القادر آنکہ انواع کرامات شد از وی صادر

از سوی ام علوی بود و حسینی بہ نسب بود آمادہ پی تربیتش رحمت رب

شاہ ثبات کی ایک مثنوی ”شہد و شیر“ کے عنوان سے ہے۔ یہ مثنوی ”نان و پنیر“ نام کی مثنوی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی نان و پنیر میں صوفیوں کی جماعت کی اہانت کی گئی تھی اور اہل تصوف کے افکار و اطوار کو مورد طنز و تضحیک قرار دیا گیا تھا۔ شاہ ثبات نے اس مثنوی کے ذریعہ صوفیہ کا دفاع کیا ہے اور مصنف نان و پنیر کا شافی اور دندان شکن جواب دلائل و شواہد کی روشنی میں دیا ہے۔ مثنوی کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بوزنہ لذات ادراک کی شناخت شپرہ در روز روشن کی بتافت
صوفیان پاک را ذم می کنی نسبت تر پاک باسم می کنی
کالی را ناقصی گر گفت بد باعث آن نیست جز بغض و حسد
عبدالجلیل بلگرامی کے فرزند میر محمد متخلص بہ شاعر ۱۱۰۱ھ میں متولد ہوئے تھے۔ بڑے
زیرک و ذہین تھے اور فارسی کے مستعد و ہنرمند شاعر تھے۔ ان کی تصنیف کی ہوئی مثنوی موسوم بہ
”ناز و نیاز“ سید علی بلگرامی اور شاہ فیاض کی عاشقی کے موضوع پر ہے۔

میرزا اسد اللہ خاں غالب مثنوی ۱۸۶۹ء شاعر دوزبانہ فارسی و اردو، فارسی غزل گوئی میں
غیر معمولی قدرت و استعداد رکھنے کے باوصف ایک ہنرمند مثنوی سرا بھی تھے۔ وہ کئی مثنویوں کے
خالق ہیں، مثلاً ”ابر گہر بار“، ”درد و داغ“، ”چراغ دیر“ اور مثنوی در بیان نموداری شان نبوت و
ولایت کہ در حقیقت پر تو نور الانوار حضرت الوہیت است۔ مثنوی ابر گہر بار کا موضوع غزوات
سید المرسلینؐ ہے لیکن غالب اس مثنوی کو مکمل نہیں کر سکے تھے۔ فقط چند تمہیدی عنوانات کے تحت
اس موضوع پر اشعار لکھے جاسکے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں یہ مثنوی زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ اس
نا تمام مثنوی کے باب معراج سید المرسلینؐ کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

شہی دیدہ روشن کن دلفروز ز اجزای خود سرمہ چشم روز
در آن روز فرخندہ آفتاب تخت ہمہ روز خود را بہ خورشید شست
شدہ چشم اعلیٰ در آن جوش نور تماشا گر حال اہل قبور
اس نا تمام مثنوی میں ۱۰۹۸ ابیات ہیں۔

غالب کی مثنوی موسوم بہ درد و داغ اس فکر پر مبنی ہے کہ مقدر بشر میں جو چیز لکھی جا چکی ہے

وہ تغیر ناپذیر ہے۔ انسان ہزار ہاتھ پاؤں مارے، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مثنوی تین بد نصیب اشخاص کی ایک اندوہناک کہانی ہے۔ یہ ہیں ایک جوان دہقان اور اس کے ماں باپ۔ یہ مثنوی ۱۱۸۷ بیات پہ مشتمل ہے۔ اس کا آغاز بقرا ذیل ہوتا ہے:

بی ثمری برزگری پیشہ داشت در دل صحرای جنون ریشہ داشت
دست تہی آئینہ قسمتش زخم دل و داغ جگر دولتش
خانہ اش از دشت خطرناک تر پیر ہنش از جگرش چاکتر

قضا و قدر نے اس الم نصیب خانوادے کی تقدیر میں مفلسی و محرومی لکھ دی تھی، اس لیے ایک فقیر روشن ضمیر کی دعاؤں کی برکت سے عیش و نشاط کی زندگی حاصل کر لینے کے باوجود اسے آخر الامر یہ راس نہیں آئی۔ غالب کی ایک مثنوی بعنوان ”در بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت است“ ہے۔ اس مثنوی کو غالب نے اپنے دوست مولانا فضل حق خیر آبادی کی فرمائش پہ لکھی تھی۔ اس کا موضوع حضرت خاتم النبیین محمدؐ کی نظیر کا امتناع ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مسائل بھی مثلاً رسول کریمؐ کے موئے مبارک کی حرمت، میلاد نبیؐ کی محفلوں کا انعقاد وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ یہ مثنوی ایک سواٹھائیس اشعار پہ محتوی ہے۔ دراصل مسلک اہل حدیث کے بعض خیالات کو رد کرنے کے مقصد سے مولانا خیر آبادی نے غالب سے یہ مثنوی لکھوائی تھی۔ امتناع نظیر رسول کریمؐ کی بابت مولانا اسماعیل شہیدؒ کی رائے یہ تھی کہ مثیل حضرت محمدؐ اس وجہ سے ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کی خاتمیت کے منافی ہے لیکن مولانا خیر آبادی کا نظریہ یہ تھا کہ مثیل رسول کریمؐ ممتنع بالذات ہے۔ غالب کی ایک اور مثنوی بعنوان ”چراغ دیر“ ایک سونو اشعار میں منظوم ہوئی ہے۔ یہ ۱۸۲۶ء کے فروری، مارچ کے مہینوں میں منظوم ہوئی تھی۔ جب اثنائے مسافرت برائے کلکتہ غالب اسی سال جنوری کے اواخر میں بنارس پہنچے تھے۔ بنارس کے دل فریب مناظر نے ان کی طبیعت میں جذب و جنون کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ رود گنگ میں غسل کرتی ہوئی پری تمثال حسینوں کے جلوے، صبح و شام کی روح پرور فضا اور نہایت لطیف آب و ہوا سے غالب بے حد محظوظ و متمتع ہوئے تھے۔ چنانچہ ان نشاط انگیز کیفیتوں سے مغلوب ہو کر انہوں نے اس مثنوی کو منظوم کیا تھا۔ ”چراغ دیر“ کا اس طرح ہوتا ہے:

نفس با صور و مساز است امروز خموشی محشر راز است امروز
رگ سنگم شراری می نویسم کف خاکی غباری می نویسم
مثنوی کا خاتمہ درج ذیل صوفیانہ اشعار پہ ہوتا ہے:

ہوس را سر بہ بالین فضا نہ نفس را از دل آتش زیر پانہ
دل از تاب بلا بگداز و خون کن ز دانش کار نکشاید جنون کن
ز الّا دم مزین تسلیم لا شو بگو اللہ و برق ما سوا شو

اقبال ابتدا میں اردو زبان میں شعر کہتے تھے لیکن جب ان کا اندیشہ و خیال وطنیت کے محدود دائرے سے نکل کر نوع انسان، حیات و کائنات اور تمام عالم کے مظلوم ”انسانوں“ خصوصیت سے ایشیا کے باشندوں کی طرف مبذول ہوا اور اس کے سبب ان کے مطمح نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور مفاہیم و موضوعات میں عمق و ابجاد کی افزونی ہوئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان من حیث وسیلہ اظہار ان کے لیے ناکافی اور ناقابل انحصار ہے۔ لہذا اپنے بلند و بالیدہ افکار کے ابلاغ کے لیے انہوں نے فارسی زبان کو بروئے کار لانا لازم سمجھا۔ اقبال کہتے ہیں:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است طرز گفتار دری شیریں تراست
پاری از رفعت اندیشہ ایم در خورد با فطرت اندیشہ ایم

اقبال اپنے افکار گراں مایہ کی ترسیل کے لیے غزل، رباعی، قطعہ کے علاوہ مثنوی کے قالب کو بھی بروئے کار لائے۔ انہوں نے پانچ مثنویاں نظم کی ہیں۔ ان کی پہلی مثنوی ”اسرار خودی“ ہے۔ اس مثنوی میں اقبال مولوی رومی کا ذکر ارادت و شوق صمیمانہ کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کے بعد اس خواب کی تعبیر و تشریح کرتے ہیں جس میں انہیں رومی کے دیدار کا فیض حاصل ہوا تھا۔ وہ اسی خواب کو اس مثنوی کا محرک قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

روی خود بنمود پیر حق سرشت کو بہ حرف پہلوی قرآن نوشت
گفت ای دیوانہ ارباب عشق جرمہ ای گیر از شراب ناب عشق
آتش استی بزم عالم را فروز دیگران را علم ز سوز خود معبود

اسرار خودی رومی کی معروف بحر (رمل مسدس محذوف یا مقصور) میں لکھی گئی ہے۔

۱۹۱۵ء میں پہلی بار یہ مثنوی طبع ہوئی تھی۔ ذکر خودی پہ مثنوی اشعار میں عظمت و قوت عشق کو بیان کیا گیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ خود و عشق کے تصورات کو اقبال نے رومی کے الہام بخش پیام سے اخذ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

شمع خود را ہم چو رومی برفروز روم را در آتش تبریز سوز
 ”رموز بے خودی“، اسرار خودی“ کا ایک دوسرا بخش ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی، اقبال نے جس طرح خودی کو مخصوص معنی و مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے، اسی طرح وہ بے خودی کی اصطلاح کو بھی نئی معنویت بخشتے ہیں۔ اس مثنوی میں بھی فکر رومی کی تاثیرات واضح ہیں۔ اقبال رومی کے اشعار کی تضمین بطور ذیل کرتے ہیں:

مرشد رومی چه خوش فرموده است آنکہ یم در قطره اش آسوده است
 مگسل از ختم الرسل ایام خویش تنکہ کم کن برفن و برگام خویش
 اقبال نے اس مثنوی میں فرد و ملت کے رابطے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ وہ اس امر پہ تاکید کرتے ہیں کہ فرد ملت سے اور ملت فرد سے قوت حاصل کرتی ہے اور حیات بشر کو کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ جماعت سے اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔

”جاوید نامہ“ اقبال کی معروف ترین مثنوی ہے۔ یہ دراصل شاعر کی ایک خیالی سیر افلاک کا ماجرا ہے۔ یہ مثنوی انسان کی معراج کا ایک موثر و نہایت ہنرمندانہ انداز میں بیان کیا ہوا نمائش نامہ ہے جس میں اقبال نے فلسفہ حیات کو تمثیل و تخیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کی نگارش کی محرک دانتے کا طریقہ الہی اور ابن عربی کی فتوحات مکیہ رہی ہیں۔ سیر افلاک میں ابتدا سے انتہا تک پیر رومی اقبال کی دستگیری کرتے ہیں اور افلاک میں ان کی ملاقات عظیم المرتبت وفات یافتہ شخصیتوں سے کراتے ہیں۔ رومی حقیقت کے جلووں کے دیدار کے لیے اقبال کو ورائے افلاک لے جاتے ہیں۔

اقبال رومی سے وجود و عدم کی حقیقت کی بابت سوال کرتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں رومی کی روح شعور و آگہی کے نکات و رموز کو نہایت دلنشین انداز میں بیان کرتی ہے۔ اقبال رومی سے اپنی قربت و صحبت اور حصول فیض و سعادت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

رومی آن عشق و محبت را دلیل تشنه کامان را کلامش سلسبیل
 پیر روم آن صاحب ذکر جمیل ضرب او را سطوت ضرب کلیم
 مثنوی ”مسافر“ کو اقبال نے افغانستان کی مسافرت کے بعد نظم کیا تھا۔ اقبال کا یہ سفر
 ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو افغانستان کے بادشاہ کی دعوت پہ ہوا تھا۔ یہ مثنوی ”خطاب بہ اقوام سرحد“
 کے عنوان کے تحت نہایت مختصانہ پند و موعظت کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:
 رزق از حق جو مجو از زید و عمر مستی از حق جو مجو از بنگ و خمر
 دل بجوتا جاویدان باشی جوان از تجلی چہرہ ات چون ارغوان
 اقبال کی آخری مثنوی ”پس چہ باید کرد ای اقوام شرق“ ہے۔ اقبال اس مثنوی میں
 استعماری حکومتوں کی سیاست اور ان کے طرز نظام کا مقایسہ حکومت الہی سے کرتے ہیں۔ تمہید
 میں پیر رومی کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں مشرق میں حیات نو کے آثار اسی دانائے راز کے افکار سے ظہور
 میں آئیں گے۔ چند اشعار اس طرح ہیں:

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق و مستی را امیر
 منزلش برتر ز ماہ و آفتاب خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
 نور قران در میان سینہ اش جام جم شرمندہ از آئینہ اش

منابع و مآخذ

- مجمع النفائس۔ سراج الدین علی خان آرزو۔ نسخہ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۲۳۷۔
 نشر عشق۔ عاشقی عظیم آبادی۔ نسخہ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۲۴۱۔
 کلیات حسینی۔ میر محمد شریف الحسینی نسخہ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۴۳۹۲۔
 مثنوی در مکنون۔ شمس الدین فقیر۔ نسخہ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۳۵۴۷۔
 مثنوی بشارت العامت۔ غلام حسین طباطبائی۔ نسخہ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۱۹۹۱۔
 صحف ابراہیم (تذکرہ) ابراہیم خلیل۔ نسخہ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۲۲۸۔
 تذکرہ ریاض الشعراء۔ والد داغستانی۔ مطبوعہ۔ مرتبہ شریف حسین قاسمی، کتاب خانہ راضا رام پور۔
 تذکرہ سفینہ خوشگو۔ نندرا بن داس خوشگو۔ مرتبہ۔ مرتبہ عطاء الرحمن کاکوی۔ پٹنہ۔

تذکرہ سفینہ ہندی۔ بھگوان داس ہندی۔ مطبوعہ۔ مرتبہ عطاء الرحمن کاکوی۔ پٹنہ۔

تذکرہ انیس الاحباء۔ موبہن لعل انیس۔ مطبوعہ۔ مرتبہ پروفیسر سید انوار احمد۔ کتاب خانہ خدا بخش پٹنہ۔

مثنوی ہدایت و بشارت۔ بوعلی قلندر پانی پتی۔ مطبوعہ۔ مرتبہ علی حیدر نیر۔ پٹنہ۔

مثنوی نیرنگ عشق۔ غنیمت کنجاہی۔ مطبوعہ۔ نول کشور۔

مثنوی شرم مراد۔ امای بلگرامی۔ مطبوعہ۔ مطبع نور الانوار آرہ۔ ۱۲۹۲ھ۔

مثنوی شورش عشق۔ امای بلگرامی۔ مطبوعہ۔ مطبع نور الانوار آرہ۔ ۱۲۹۲ھ۔

مثنوی نیرنگ تقدیر۔ پیارے لعل الفتی۔ مطبوعہ۔ پٹنہ۔ ۱۲۹۸ھ۔

مثنوی نہ سپہر۔ امیر خسرو۔ مطبوعہ۔ علی گڑھ۔

مثنوی قرآن السعدین۔ امیر خسرو۔ مطبوعہ۔ علی گڑھ۔

مثنوی دولرانی خضر خان۔ امیر خسرو۔ مطبوعہ۔ مرتبہ رشید احمد۔ علی گڑھ۔

مثنوی آصف نامہ۔ میر فرزند علی موزون۔ مطبوعہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی۔ پٹنہ۔

مثنوی والہ و سلطان۔ شمس الدین فقیر۔ مطبوعہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی۔ پٹنہ۔

مثنوی گل فردوس۔ شاہ امین احمد ثبات۔ مطبوعہ۔ نول کشور لکھنؤ۔

مثنوی گل بہشتی۔ شاہ امین احمد ثبات۔ مطبوعہ۔ انوار محمدی لکھنؤ۔

فہرست نسخہ ہای خطی کتاب خانہ ایوان ہند لندن

فہرست کتاب خانہ موزہ بریتانیا لندن

فہارس توضیحی (شعر فارسی) کتاب خانہ خدا بخش۔

قند پارسی (فارسی مجلہ) شمارہ (۱) ۱۹۹۰ء۔ اشاعت خانہ فرہنگ ایران دہلی نو۔

قند پارسی (فارسی مجلہ) شمارہ (۱۲) ۱۲۷۹ش۔

فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۱۹۹۴ء۔

فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ زمستان ۱۳۶۴۔

فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ پائیز ۱۳۸۴۔

فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۲۵-۲۴-۱۳۶۹۔

فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۵۲-۷۶-۷۵-۶۷-۶۶۔

فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۶۳-۶۲-۱۶۲ اور ۷۷۔

بچے کی تعلیم و تربیت میں ولی کا کردار

پروفیسر نسیم محمود

اسلام ولی کی زیر نگرانی افراد کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کے بھی اصول و ضوابط وضع کرتا ہے جن کے تحت نہ صرف بچوں کی پرورش بلکہ ان کے اخلاق و عادات کو بھی اعلیٰ اوصاف سے مزین کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان اعلیٰ اوصاف میں ان کی تعلیم و تربیت، حضانت کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیا گیا ہے لہذا ذیل میں تفصیل کے ساتھ زیر حضانت افراد کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ولی (Guardian) کے کردار کا ذکر کیا جاتا ہے۔

زیر حضانت افراد کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے درج ذیل اعتبارات سے بطور خاص بحث کی جاسکتی ہے:

۱- آداب کی تعلیم۔ ۲- مذہبی تعلیمات پر عمل کی ترغیب۔

۳- لکھائی پڑھائی کی تربیت۔ ۴- عمومی اور فنی تعلیم کا انتظام۔

والدین میں سے ایک کے پاس حضانت ہو تو پھر دوسرے کو اس بچے سے ملاقات و زیارت کی اجازت اور سہولت دی جاتی ہے تاکہ والدین مل کر ان کی تربیت کر سکیں۔ والدین کی براہ راست نگرانی متوازی اور بھرپور پرورش کے لیے ضروری ہے۔ یہ صورت مطلقہ خواتین کی اولاد کی ہے جبکہ یتیم بچوں کی حضانت میں ولی اس خلاء کو پر کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ زیر حضانت بچوں کی تعلیم و تربیت چونکہ ولایت کے بنیادی فرائض میں سے ہے لہذا اس حوالے سے کتاب و سنت اور فقہی مذاہب کی روشنی میں بحث کی جائے گی۔

کتاب و سنت: کتاب و سنت میں زیر حضانت بچوں کی تعلیم و تربیت کے باب میں اہم

گورنمنٹ علامہ اقبال پوسٹ گریجویٹ کالج، سیالکوٹ۔

ضوابط کا ذکر حسب ذیل ہے:

۱- قرآن حکیم میں اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانے کا حکم یوں دیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ
وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (۱)
اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل
و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

امام جصاص اور امام ابن العربی کے نزدیک اس سے مراد اہل و عیال کی تعلیم و تربیت کرنا ہے تاکہ وہ جہنم کی آگ سے محفوظ رہ سکیں۔ (۲) امام جصاص کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

هذا يدل على أن علينا تعليم أولادنا وأهلينا الدين والخير و
يؤيت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہمارے
اوپر اپنی اولاد اور گھر والوں کی تعلیم، دین،
مالا يستغنى عنه من الادب۔ (۳) بھلائی اور ضروری آداب سکھانا لازم ہے۔

۲- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی حدیث کے مطابق مرد و عورت اپنی اولاد کے
نگران ہیں۔ رسول اللہؐ کے الفاظ یہ ہیں:

والرجل راعٍ على أهل بيته
وهو مسئول عنهم والمرأة
راعية على بيت بعلها وولده
وهي مسئولة عنهم۔ (۴)
اور مرد اپنے گھر والوں پر نگران ہے اور وہ اپنی
رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے اور عورت
اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد پر نگران
ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔

یعنی جس طرح مرد و عورت اپنی رعایا کی بہت سے امور میں نگرانی کرتے ہیں اسی
طرح ان کی تعلیم و تربیت بھی ان کے ذمے ہے۔ امام جصاص اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

فكذلك عليه تأديبه و
تعليمه۔ (۵)
سوا اسی طرح اس پر اس کی تعلیم و تربیت
لازم ہے۔

۳- رسول اللہؐ نے سات سال کی عمر میں بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ امام ابوداؤد کے
الفاظ حسب ذیل ہیں:

مروا الصبي بالصلوة إذا بلغ
سبع سنين وإذا بلغ عشر
بچے کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو
اور جب وہ دس سال کا ہو تو نماز کی ادائیگی

سنین فاضربوہ علیہا۔ (۶) کے لیے اسے مارو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

و فرقوا بینہم فی المضاجع۔ (۷) اور (دس سال کی عمر میں) ان کو بستروں

سے جدا کر دو۔

یہ حکم بھی ان کو آداب سکھانے کے لیے دیا گیا ہے۔

امام جصاص بچے کو نماز کے حکم پر مشتمل حدیث کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

فمن کان سنہ سبعة فہو مأمور

بالصلاة علی وجہ التعليم

والتأديب۔ (۸) و تا دیب کے طور پر نماز پڑھانے کا حکم دیا

۴۔ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لأن يؤدب الرجل ولده خیر

من يتصدق بصاع۔ (۹) صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

اس روایت کے مطابق اپنی اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت صدقہ و خیرات سے بہتر قرار دی

گئی ہے۔

۵۔ امام ترمذی ایک اور حدیث بیان کرتے ہیں جس میں والد کی طرف سے اولاد

کے لیے بہترین تحفہ حسن ادب قرار دیا گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ما نحل والد ولدًا من نحل

افضل من ادب حسن۔ (۱۰) کوئی والد اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بڑھ

معلوم ہوا کہ کتاب و سنت کے مطابق اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا، دین سکھانا، بھلائی کی

باتیں اور ضروری آداب سکھانا والدین کی ذمہ داری ہے۔ اس تعلیم و تربیت کو والدین کی طرف

سے اولاد کے حق میں بہترین تحفہ اور صدقہ و خیرات سے بہتر عمل قرار دیا گیا ہے۔

فقہی مذاہب: آگے زیر حضانت افراد کی تعلیم و تربیت کو فقہی مذاہب کی روشنی میں بیان

کیا جائے گا۔

احناف: احناف کے نزدیک زیر حضانت افراد کی تعلیم و تربیت کے باب میں ولی کے کردار کے ضوابط حسب ذیل ہیں:

۱۔ خواتین ابتدائی عمر میں بچوں کی تربیت کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہیں۔ امام کاسانی کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

والأصل فيها النساء لأنهن
أشفق وأرفق وأهدى إلى تربية
الصغار۔ (۱۱)

اور حضانت میں اصل حق خواتین کا ہے
کیونکہ وہ زیادہ شفیق، رحم دل اور بچوں کی
تربیت کے لیے ہدایت یافتہ ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو ابتدائی عمر میں خواتین کی تربیت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو حضانت کا زیادہ حق دار قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ بچی بلوغت تک ماں کی حضانت میں رہے گی تاکہ خواتین کے آداب و اخلاق اور گھر کی خدمت کی تعلیم دی جاسکے۔ امام کاسانی کے الفاظ یہ ہیں:

وهذا المعنى لا يوجد في
الجارية تترك في يد الام بل
تمس الحاجة الى الترك في
يدها إلى وقت البلوغ لحاجتها
إلى تعليم آداب النساء والتخلق
بأخلاقهن وخدمة البيت۔ (۱۲)

اور یہ معنی بچی میں نہیں پایا جاتا سو اس کو ماں
کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا بلکہ اسے
خواتین کے آداب، ان کے اخلاق اپنانے
اور گھر کی خدمت کی تعلیم کی حاجت کے
سبب بلوغت تک ماں کے پاس چھوڑنے
کی ضرورت ہوتی ہے۔

سو بچیوں کو خواتین کے آداب و اخلاق اور گھر کی خدمت سکھانا ان کی تربیت کا لازمی حصہ ہے اور یہ تربیت خواتین ہی بہتر انجام دے سکتی ہیں۔

۳۔ جب بچہ خود کھانے پینے کی عمر (سات سال) کو پہنچ جائے تو اسے آدمیوں کے اخلاق و آداب سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ امام مرغینانی اور امام کاسانی نے اس کو بیان کیا ہے۔ (۱۳) امام کاسانی کے الفاظ یہ ہیں:

لأن الغلام إذا استغنى يحتاج
کیونکہ بچہ جب (کھانے، پینے اور پہننے

إلى التاديب والتخلق بأخلاق (سے) مستغنی ہو جائے تو وہ ادب سکھانے،
الرجال وتحصيل أنواع آدمیوں کے اخلاق، مختلف اقسام کے
الفضائل واكتساب اسباب فضائل اخلاق کے حاصل کرنے اور علوم
العلوم والاب على ذلك أقوم کے اسباب کے حصول کی ضرورت مند ہوتا
واقدر۔ (۱۴)

اس سے ثابت ہوا کہ سات سال کے بعد بچے کو آدمیوں کے اخلاق اور علوم کے
اسباب (تعلیم کے بنیادی امور) سکھانا باپ کی ذمہ داری ہے۔
۴۔ باپ زیر حضانت بچوں کو تجارتی، صنعتی اور فنی علوم سکھانے کے لیے ان سے اجارہ
کروا سکتے ہیں۔ امام جصاص کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

وان يؤاجرہ ممن یعلمہ اور یہ کہ وہ اس (زیر حضانت بچے) سے
الصناعات والتجارات ایسا اجارہ کروائے جس سے وہ صنعت اور
ونحوها لأن جمیع ذلك قد یقع تجارت وغیرہ کو جان سکے کیونکہ یہ تمام
على وجه الاصلاح۔ (۱۵) امور اصلاح کے لیے ہوتے ہیں۔

امام کاسانی بچے کو ہنر سکھانے کے حوالے سے فرماتے ہیں:

إن فی إیجارہ فی الصنائع من بلاشبہ فن اور کاریگری کے کام میں بچے کو
باب التہذیب والتادیب اجارہ کروانا اسے مہذب بنانے، اس کی
والریاضة۔ (۱۶) تربیت کرنے اور جسمانی ورزش کے باب

میں سے ہے۔

سو آج کے دور میں بچے کی ذات کا اجارہ مختلف انواع کی ٹیکنیکل اور فنی مہارت کے
حصول کے لیے ضروری ہے۔

شواہع: شوافع کے نزدیک زیر حضانت افراد کی تعلیم و تربیت کے باب میں ولی کے کردار
کے ضابطے حسب ذیل ہیں:

۱۔ بچہ ماں کو اختیار کرے تو ماں، باپ کو اس کی تادیب سے نہیں روک سکتی۔ امام شافعی

کے الفاظ یہ ہیں:

فإن إختار أمه فعلى أبيه سواگر وہ اپنی ماں کو اختیار کرے تو اس کے
نفقته ولا تمنع من باپ پر نفقہ لازم ہے اور وہ اس کے باپ کو
تادیبہ - (۱۷) اس کی تادیب سے منع نہیں کرے گی۔

امام شافعی اس کی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں:

ويخرج الغلام إلى الكتاب اور وہ (باپ) بچے کو کتابت اور کاریگری
والصناعة إن كان من أهلها سکھانے کے لیے لے کر جائے گا، اگر وہ اس
ویاوی عندامہ - (۱۸) کا اہل ہو اور وہ اپنی ماں کے پاس رہے گا۔
امام نووی ولی پرزیرحضانت بچے کی تعلیم و تادیب کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کے
الفاظ یہ ہیں:

تادیبہ وتعلیمہ واجب علی اس کی تادیب اور تعلیم اس کے ولی پر واجب
ولیه ابا کان أو جدًا أو وصيًا ہے خواہ وہ باپ ہو یا دادایا وصی یا منتظم۔
أو قیما - (۱۹)

مختصر یہ کہ بچے کے ماں کو اختیار کرنے کی صورت میں بھی باپ پر بچے کی تعلیم و تربیت
لازم ہے۔

۲۔ اگر بچہ اپنے باپ کو اختیار کرے تو باپ اسے اس کی ماں کی زیارت سے منع نہیں کر
سکتا۔ امام شافعی کے الفاظ یہ ہیں:

وإن أختار أباه لم يكن لأبيه اور اگر بچہ اپنے باپ کو اختیار کرے تو اس کے
منعه من أن يأتی أمه وتاتیہ باپ کے لیے اس کو اپنی ماں کے پاس آنے
فی الايام - (۲۰) سے منع کرنا جائز نہیں اور اس کی ماں اس
کے پاس دن کے اوقات میں آئے گی۔

امام شیرازی اس کی وجہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

لأن المنع من ذلك إغراء کیونکہ اس سے منع کرنا نافرمانی اور رشتہ داری

بالعقوق وقطع الرحم فإن
مرض كانت الأم أحق
کو ختم کرنے پر ابھارنا ہے تو اگر وہ بیمار ہو
جائے تو ماں اس کی عیادت کرنے کی زیادہ
بتمریضہ۔ (۲۱) حق دار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں سے ملاقات کر سکتا ہے اور ماں اس سے ملاقات کر سکتی
ہے تاکہ ماں کی شفقت بھی میسر آ سکے۔

۳۔ اگر بچی ہو تو اس کی ماں کو اس کے پاس آنے سے منع نہیں کیا جائے گا اور اگر ماں
بیمار ہو تو بچی عیادت کے لیے جائے گی۔ امام شافعی فرماتے ہیں:

وإن كانت جارية لم تمنع
أمها من أن تأتيها ولا أعلم
على أبيها إخراجها إليها
إلا من مرض فيؤمر بإخراجها
عائدة۔ (۲۲)
اور اگر بچی ہو تو اس کی ماں کو اس کے پاس
آنے سے منع نہ کیا جائے اور میں اس کے
باپ پر بچی کو اس کی ماں کے پاس لے
جانے کا علم نہیں رکھتا سوائے بیماری کے کہ
ماں کی عیادت کے لیے اسے وہاں لے
جانے کا حکم دیا جائے گا۔

۴۔ امام ماوردی کے مطابق اگر بچی اپنی ماں کو اختیار کرے تو رات دن بچی کی حق دار
ہے کیونکہ بچی حیا دار ہوتی ہے۔ سو اس کا باہر نکلنا منع ہے تاکہ اس کی حفاظت ہو سکے اور اس کے
باپ کے لیے اس کی زیارت جائز ہے تاکہ آپس میں الفت و محبت قائم ہو۔ ملاقات کے وقت
زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا مگر زیارت کے وقت محرم مرد یا ثقہ خواتین ہوں تاکہ طلاق ہونے کے بعد
خلوت کے شک کی نفی ہو سکے۔ (۲۳)

بچی کے لیے دونوں صورتوں میں والدین کی ملاقات کی اجازت سے ان کی بہتر تربیت
مقصود ہے۔

حنابلہ: حنابلہ کے نزدیک زیر حضانت افراد کے لیے تعلیم و تربیت کے باب میں ولایت
کے کردار کے ضوابط حسب ذیل ہیں:

۱۔ بچی کو کاتنے اور پکانے کی گھر میں تعلیم کا اہتمام کیا جائے گا۔ امام ابن قدامہ کے

الفاظ یہ ہیں:

إذا كانت الجارية عند الأم أو جب بچی ماں یا باپ کے پاس ہو تو وہ اس
عند الأب فإنها تكون عنده ليلاً کے پاس دن رات رہے گی کیونکہ اس کو
ونهاراً لأن تاديبها و تخريجها ادب سکھانا اور ٹریننگ دینا گھر کے اندر
فی جوف البيت من تعليمها ہوتا ہے جیسے کاتنا، پکانا وغیرہ اور اس کے
الغزل والطبخ وغيرها ولا لیے اسے گھر سے باہر لے جانے کی
حاجة بها الى الاخراج منه۔ (۲۴) ضرورت نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچی گھر کے امور میں مہارت حاصل کرے گی۔ اس ضمن میں وہ
بطور خاص سینے اور باورچی خانہ کی ذمہ داریوں کے متعلقہ علوم حاصل کرے تاکہ وہ عملی زندگی میں
کامیاب ہو سکے۔

۲۔ والدین میں سے کسی ایک کے پاس بچی ہو تو دوسرے کو زیارت سے منع نہیں کیا
جائے گا۔ امام ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں:

ولا يمنع أحدهما من زیارتها اور ان دونوں میں سے ایک دوسرے کو اس
عند الآخر من غير أن يخلو بچی کی زیارت سے منع نہیں کرے گی بغیر
الزوج بامها ولا يطيل۔ (۲۵) اس کے کہ خاوند اس کی ماں کے ساتھ
خلوت (علاحدگی اور تنہائی) میں نہ رہے
اور نہ وہ زیادہ دیر قیام کرے۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

وإن مرضت فالأم أحق اور اگر وہ بیمار ہو جائے تو ماں اس کے گھر
بتمريضها فی بيتها۔ (۲۶) میں اس کی تیمارداری کی زیادہ حق دار ہے۔

ان عبارتوں سے حسب ذیل ضابطے ثابت ہوئے:

۱۔ والدین میں سے ایک کو دوسرے کے لیے اولاد کو دیکھنے کی اجازت۔

۲۔ خاوند کا اپنی مطلقہ بیوی کے ساتھ تنہائی سے اجتناب۔

۳۔ خاوند کے لیے اس کے ہاں طویل قیام کی ممانعت۔

۴۔ بچہ بیمار ہو تو ماں تیمارداری کی زیادہ حق دار۔

۳۔ بچہ سات سال کے بعد اپنے اختیار کے ساتھ ماں کے پاس ہو تو ماں کے پاس رات کے وقت ہوگا اور دن کے وقت باپ مدرسے یا کارخانے میں لے جائے گا۔ امام ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں:

كان عندها ليلاً ويأخذها الأب وہ بچہ اس (ماں) کے پاس رات کو ہوگا
نهاراً ليسلمه في مكتب أوفي اور باپ دن کے وقت اسے لے گا تاکہ
صناعة۔ (۲۷) اسے مدرسے یا انڈسٹری میں چھوڑ سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں کے پاس ہو تو باپ اس کی عمومی تعلیم یا فنی تعلیم کا انتظام کرے گا۔
۴۔ اگر بچہ سات سال کے بعد باپ کے پاس ہو تو دن رات اس کے پاس رہے گا مگر اسے ماں کے پاس آنے جانے سے نہیں روکے گا۔ المغنی میں ہے:

ولا يمنع من زيارة أمه لأن اور وہ (باپ) اس کو اپنی ماں کی زیارت
منعه من ذلك إغراء بالعقوق سے نہیں روکے گا کیونکہ اس کا منع کرنا
وقطعية الرحم وإن مرض نافرمانی اور رشتہ داری ختم کرنے پر ابھارنا
كانت الأم أحق بتمريضه في ہے اور اگر بیمار ہو تو ماں اپنے گھر میں اس
بيتها۔ (۲۸) کی تیمارداری کی زیادہ حق دار ہے۔

۵۔ والدین میں سے کسی ایک کے بیمار ہونے یا وفات پانے پر آنے سے بچی اور بچے کو روکا نہیں جائے گا۔ المغنی میں ہے:

وإن مرض أحد الأبوين عند اور اگر والدین میں سے کوئی بیمار ہو جائے اور بچہ
الآخر لم يمنع من عيادته دوسرے کے پاس ہو تو اس کو عیادت سے منع نہیں
وحضوره عند موته سواء كان کیا جائے گا اور اس کی موت کے وقت حاضر ہونے
ذكرًا أو أنثى۔ (۲۹) سے بھی منع نہیں کیا جائے گا خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔

ان مسائل سے درج ذیل امور ثابت ہوئے:

۱- سرپرستوں کے لیے بچے اور بچی کی تعلیم اور فنی مہارت کا اہتمام۔

۲- والدین سے ملاقات کا انتظام۔

مالکیہ: مالکیہ کے نزدیک زیر حضانت بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ولی کا کردار حسب ذیل ہے:

۱- بچہ ماں کی حضانت میں ہو تو باپ دن کے وقت تادیب و تعلیم کا انتظام کرے گا۔
امام سخون فرماتے ہیں:

قال مالك يؤدبه بالنهار
ويبعثه إلى الكتاب وينقلب
إلى أمه بالليل في حضانتها
ويؤدبه عنده - (۳۰)
امام مالک نے فرمایا وہ دن کے وقت اس کو ادب سکھائے اور اس کو کتابوں کے پاس بھیجے اور وہ رات کو ماں کی حضانت میں چلا جائے اور وہ اس کو اس کی ماں کے پاس ادب سکھائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں کی حضانت میں ہو تو باپ دن کے وقت اس کی تربیت کا اہتمام کرے اور زیرو لایت بچوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش کے اخراجات کا ذمہ دار بھی باپ ہی ہے۔ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو جن کی سرپرستی میں بچہ ہے ان پر حضانت کے اخراجات لازم ہوں گے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱- کتاب و سنت میں بچوں کی تعلیم و تربیت کو والدین پر لازم قرار دیا گیا ہے۔
۲- مذاہب اربعہ کے مطابق بچوں کی تربیت، مردوں کے آداب کی تعلیم، کتابت کی مشق نیز تجارت، صنعت وغیرہ فنی تعلیم زیرو لایت افراد کو دلانا سرپرستوں کے فرائض میں ہے۔
۳- بچیوں کی تربیت، خواتین کے آداب نیز ان کو گھریلو امور جیسے کاتنے اور پکانے کی مہارت سکھانا بھی سرپرستوں پر لازم ہے۔

۴- والدین میں اگر علاحدگی ہو گئی ہے اور ان میں کسی ایک کے پاس بچہ یا بچی ہو تو دوسرے کو اس سے ملاقات کی اجازت ہوگی تاکہ ممکنہ حد تک بچے کی بہتر تربیت ممکن ہو۔
مروجہ قوانین: زیر حضانت بچوں کی تعلیم و تربیت کا گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ میں یوں ذکر ہے:

And must look to his support, health and

education. (۳۱)

اور ولی (اپنے زیر حضانت بچے کی) مدد، صحت اور تعلیم کا ضرور خیال رکھے۔
عدالتی فیصلہ جات: عدالتی فیصلوں میں بھی حضانت کے حق کا فیصلہ بچوں کی بہبود کے حوالے سے ہوتا ہے اور ان کی بہبود میں بنیادی اہمیت ان کی تعلیم و تربیت کو حاصل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے بعض فیصلوں حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسز روبیہ گیلانی بنام ظہور اختر راجہ کیس سپریم کورٹ آف پاکستان میں جسٹس اجمل میاں، جسٹس منور احمد مرزا اور جسٹس چوہدری محمد عارف کی عدالت میں پیش ہوا۔ ان کے تینوں بچے (عمر، حارث، خالد) نو سال سے زائد عمر کے تھے اور باپ کی حضانت میں تھے مگر لارنس کالج مری میں بچوں کی تعلیم کے سبب اپنی والدہ سے دور تھے۔ اس لیے ماں سے ملاقات ممکن نہ تھی لہذا ماں کے لیے حضانت کا مطالبہ کیا گیا مگر فاضل عدالت نے اچھی تعلیمی سہولتوں کے سبب باپ کے حق میں حضانت کا فیصلہ کیا۔ اس کا ذکر فیصلے میں یوں ہے:

Thus, considering the broad details of the present case and background of circumstances we have no doubt that respondent by educating the children at Lawrence College Murree is providing them proper educational facilities, therefore, it would not be fair to disturb the right of respondent regarding their custody. (۳۲)

یوں موجودہ کیس اور حالات کے پس منظر کی مکمل تفصیلات پر غور کرتے ہوئے ہمیں کوئی شک نہیں ہے کہ مدعا علیہ کے ذریعے بچوں کو لارنس کالج مری میں تعلیم دلانا مناسب تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا ہے۔ اس لیے مدعا علیہ کے حق میں حضانت کے اعتبار سے خلل ڈالنا مناسب نہیں ہے۔
اس فیصلے میں بنیاداً ان بچوں کی بہتر تعلیم کو قرار دیا گیا ہے۔
اس فیصلے میں بچے کے کردار کی تکمیل کا ذکر یوں کیا:

However, we simultaneously feel that character of the child is not fully developed in the absence of maternal affection. (۳۳)

تاہم بیک وقت محسوس کرتے ہیں کہ ماں کی محبت و شفقت کے بغیر بچے کے کردار کو مکمل طور پر پروان نہیں چڑھایا جاسکتا۔

اس لیے عدالت نے ان بچوں سے ماں کی ملاقات کا حسب ذیل معمول وضع کیا۔
 ۱= بچے موسم گرما اور سرما کی تعطیلات کے دوران لاہور میں اپنی والدہ کے ساتھ رہیں گے۔
 ب= ماں کالج کے پرنسپل سے اجازت لے کر مہینے میں ایک بار کالج میں بچوں سے ملاقات کر سکیں گی۔

۲۔ مسز اسلم خاتون بنام محمد منیر کیس لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس سید نجم الحسن کاظمی کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس میں نو سالہ بچے اور آٹھ سالہ بچی کی حضانت کا معاملہ تھا۔ دونوں بچے لاثانی کیڈٹ پبلک سکول میں پڑھ رہے تھے۔ مناسب تعلیم اور اچھی صحت کے سبب ماں کو حضانت کا حق دیا گیا۔ اور باپ کے لیے ہر مہینے کے پہلے اور آخری سوموار عدالتی حدود اور عدالتی اوقات کے دوران بچوں سے ملاقات کی اجازت دی گئی۔ (۳۴)

۳۔ مسز نسیم کوثر بنام سلیم وغیرہ کیس لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس عبدالشکور پراچہ کی عدالت میں پیش ہوا، یہ محمد عاقب سلیم کی حضانت کا کیس تھا۔ اس فیصلے میں ماں کو حضانت کا حق دار قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باپ کی نسبت ماں زیادہ بچے کی بہبود کی دیکھ بھال کر سکتی ہے کیونکہ باپ سپئر پارٹس کی دوکان پر زیادہ وقت صرف کرنے کے سبب اسے زیادہ وقت نہیں دے سکے گا۔ یوں بچے کو تمام وقت سوتیلی ماں کے پاس گزارنا پڑے گا۔ عدالت نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ سرپرست جج باپ کی اپنے بچے کے ساتھ ملاقات کا پندرہ روزہ معمول بنائے گا اور اس کے علاوہ عید کی تعطیلات، موسم گرما اور موسم سرما کی تعطیلات کے دوران بھی ملاقات کا انتظام کرے گا۔ (۳۵)

ان عدالتی فیصلوں سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ حق حضانت کے لیے بہتر تعلیم و تربیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور عام طور پر اسی

بنا پر حضانت کا فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ یہ حضانت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

۲- والدین میں سے کسی ایک کے پاس حضانت ہو تو دوسرے کو اس بچے سے ملاقات کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ بچے کو ماں باپ کی محبت و شفقت کے ساتھ ساتھ تحفظ کا احساس بھی حاصل ہو اور یوں ان کے کردار کی ممکنہ حد تک تکمیل ہو سکے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ کتاب و سنت، مذاہب اربعہ اور مروجہ قوانین کے مطابق زیر ولایت افراد کی بہتر تعلیم و تربیت سرپرستوں پر لازم ہے۔ عدالتی فیصلہ جات میں بھی بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کو حضانت کے استحقاق کے لیے اہم حیثیت حاصل ہوتی ہے نیز عدالتی فیصلہ جات میں والدین میں سے کسی ایک کے پاس حضانت کی صورت میں دوسرے کے لیے ملاقات کے باقاعدہ پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام: ۱- کتاب و سنت کے مطابق بچوں کی تعلیم و تربیت والدین پر لازم ہے۔ مذاہب اربعہ کے مطابق بچوں کی تربیت، مردوں کے آداب، کتابت کی ٹریننگ نیز تجارت، صنعت جیسی فنی تعلیم سرپرستوں پر لازم ہے۔

۲- بچوں کی تربیت، خواتین کے آداب نیز امور خانہ داری کی مہارت سکھانا بھی سرپرستوں کا فرض ہے۔

۳- طلاق یافتہ والدین میں سے کسی ایک کے پاس بچہ یا بچی ہو تو دوسرے کو اس سے ملاقات کی اجازت ہوگی تاکہ بچے کی بہتر تربیت ممکن ہو۔

۴- مروجہ قوانین میں بھی زیر حضانت افراد کی تعلیم سرپرستوں کے فرائض میں سے ہے نیز عدالتی فیصلوں میں بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں والدین میں سے کسی ایک کے پاس حضانت ہو تو دوسرے کو بچوں سے ملاقات کے باقاعدہ شیڈول کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ ان کی تربیت کی تکمیل ہو سکے۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) التحریم، ۶۶/۶- (۲) بصاص، ابو بکر احمد بن علی رازی، (م ۳۷۰ھ)، احکام القرآن، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۶۹۷/۳؛ ابن العربی، ابو بکر محمد بن عبداللہ، (م ۵۴۳ھ)، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی،

بیروت، لبنان، ۲۷۵/۴ - (۳) جصاص، احکام القرآن، ۶۹۷/۳ - (۴) مسلم بن حجاج قشیری، (م ۲۶۱ھ)،
الجامع الصحيح، کتاب الامارة، باب فضيلة الامير العادل وعقوبة الجائر والحث على المرفق بالرعية، قدیمی کتب خانہ
کراچی، طبع دوم، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء، ۱۲۲/۲ - (۵) جصاص، احکام القرآن، ۶۹۷/۳ - (۶) ابو داؤد، سليمان بن
اشعث، (م ۲۷۵ھ)، السنن، کتاب الصلوة، باب متى يؤمر الغلام بالصلوة، مکتبہ المدادیہ، ملتان، ۷۷/۱ -
(۷) الايضاً ۷۷-۷۷ - (۸) جصاص، احکام القرآن، ۵۵۲/۱ - (۹) ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، (م ۲۷۹ھ)،
الجامع، ابواب البر والصلوة، باب ما جاء في ادب الولد، اسلامي کتب خانہ، دیوبند، بھارت، ۱۶/۲، ۱۹۸۵ء -
(۱۰) الايضاً - (۱۱) کاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود، (م ۵۸۷ھ)، بدائع الصنائع، مکتبہ رشیدیہ،
کوئٹہ، ۲۷۶/۳ - (۱۲) الايضاً ۲۷۶/۳ - (۱۳) مرغینانی، علی بن ابی بکر (م ۵۹۳ھ)، الھدایہ، مکتبہ رحمانیہ،
لاہور، ۲۴۲/۲: کاسانی، بدائع الصنائع، ۲۷۶/۳ - (۱۴) کاسانی، بدائع الصنائع، ۲۷۶/۳ (۱۵) جصاص،
احکام القرآن، ۲۷۶/۲ (۱۶) کاسانی، بدائع الصنائع، ۲۱/۲ (۱۷) شافعی، محمد بن ادریس، (م ۲۴۰ھ)، الام،
دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۲۲۲ھ/۲۰۰۱ء، ۳۰۱/۶ - (۱۸) الايضاً ۳۰۴ - (۱۹) نووی، ابوزکریا
یحییٰ بن شرف، (م ۶۷۶ھ)، روضة الطالبین، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۲۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ۶/۱
۵۱۱ - (۲۰) شافعی، کتاب الام، ۳۰۴/۶ - (۲۱) شیرازی، ابواسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف (۳۹۳ھ -
۴۷۶ھ)، المھذب، تحقیق: دکتور محمد الزحلی، الدار الشامیہ، بیروت، لبنان، الطبعة الاولى، ۱۴۱۷ھ - ۱۹۹۶م، ۴/۱
۶۵۰ - (۲۲) شافعی، کتاب الام، ۳۰۴/۶ (۲۳) ماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب بصری، (م ۲۵۰ھ)،
کتاب النفقات، دار ابن حزم، ۲۷۰/۲ (۲۴) ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ، (م ۶۲۰ھ)، المغنی،
دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء، ۷/۱۳ - (۲۵) الايضاً - (۲۶) الايضاً، المغنی، ۷/۱۳ -
(۲۷) الايضاً - (۲۸) الايضاً - (۲۹) الايضاً - (۳۰) سحنون، عبدالسلام بن حبیب تنوخی، (م ۲۴۰ھ)، المدونة
الکبری، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، ۳/۱۰۵۲ -

31. Saghir Ahmad, *Guradians and wards Act*, 1890, Mansoor Book

House, Lahore / 9532

32. Abdul Halim, Sheikh, *The Supreme Court Monthly Review (S.C.M.R.)*,
Church Road, Lahore. Edi. 1999. p:1836.

33. 1999, S.C.M.R., 1836

34. Malik Muhammad Saeed, *The Monthly Law Digest (M.L.D.)*, 35-Nabha
Road, Lahore Edi. 2000, p:1216

35. M.A Zafar, *Shariat Law Reports (S.L.R.)*, Justice Jameel Hussain Rizvi
Road, Lahore, Edi. 2004, p:40

استدراک ”تصوف کیا ہے“ مولانا ہلال احمد قادری

معارف ماہ جنوری/فروری ۲۰۱۲ء کے شمارے میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا مضمون ”تصوف کیا ہے“ نظر سے گذرا، معارف میں اس معیار کی تحریر کی اشاعت باعث حیرت ہوئی، شاید مضمون نگار کے اصرار نے مدیران معارف کو اس کی اشاعت پر مجبور کیا، مخالف کی تحریر کو شائع کرنا یقیناً اعلیٰ ظرفی ہے، مگر اس طرح مخالف کو سلف صالحین پر دشنام طرازی کا موقع بھی دینا ہے، بقول مضمون نگار ”حق کے اظہار و اشاعت سے گریز معارف کی قدیم روایات کے خلاف ہے“ بات تو صحیح ہے مگر سلف صالحین کی تسلیل و توہین کب معارف کی قدیم روایات میں شامل رہی ہے؟

دونوں فسطوں کی تحریر پڑھنے سے عام تاثر یہ ملتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ہدایت کی راہ محفوظ نہیں رہی ہے، اور مسلمانوں کا سواد اعظم شرک و گمراہی میں مبتلا رہا ہے، اپنے فہم پر ہی اعتماد، سلف صالحین سے بے اعتمادی، خود کو ہی دین حق کا حامل سمجھنا، علماء اور مشائخ کو دین سے بے بہرہ اور گمراہ سمجھنا و انقض و خوارج کا نظریہ رہا ہے۔ اسی نظریے کی اشاعت تصوف اور اہل تصوف کے خلاف زور و شور سے جاری ہے، مذکورہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مقالہ نگار نے تصوف اور اہل تصوف کا رد و ابطال کرنے میں علمائے اہل تصوف کی توجیہات و تاویلات بھی نقل کی ہیں، لیکن ان توجیہات کو قابل قبول ہونے کے باوجود تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی کی ہر بات سے اتفاق ہو جائے لیکن معقول توجیہ کو بھی رد کر دینا، انانیت اور استکبار ہے، احقاق حق نہیں ہے، وحدۃ الوجود ہی کو لیجئے خود اہل تصوف میں ہی اس کے متعلق مختلف رائے ہے، لیکن اس نظریے کے حاملین کو مشرک و گمراہ قرار دینا کہاں تک

پھلواری شریف۔

درست ہے؟ ”ابن تیمیہ نے ابن عربی کو طواغیت میں شمار کیا ہے، ”مقالہ نگار یہ لکھ کر خوش اور مطمئن ہو گئے، ابن تیمیہ نے ”الفرقان بین اولیاء الرحمن واولیاء الشیطان“ میں ابن عربی کو اور بھی بہت کچھ کہا ہے، اولاً تو ابن تیمیہ سے بچا کون ہے، نہ اسلاف نہ ان کے معاصرین، ثانیاً یہ کہ شیخ ابن عربی کی تحریف شدہ تحریروں پر فوراً اعتماد کر لینا اہل دانش کا طریقہ نہیں ہے، ابن عربی کی تمام کتابیں محفوظ نہیں ہیں۔ امام شعرانی نے ”الیواقیت والجواہر“ میں شیخ کے قابل اعتراض اقوال کو تحریفات میں شمار کیا ہے، بالخصوص وحدۃ الوجود کے بارے میں ایسی باتیں شیخ کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں جو شیخ نے نہیں لکھی ہیں، امام شعرانی لکھتے ہیں:

و جمیع ما عارض کلامہ ظاہر الشریعة وما علیہ الجمهور فهو
مدسوس علیہ کما اخبرنی بذلك سیدی ابو الطاهر المغربي نزیل مکة
المشرقة ثم اخرج لی نسخة الفتوحات التي قابلها علی نسخة الشيخ التي
بخطه فی مدينة قونية فلم ار فيها مما كنت وقفت فيه و حذفته حين
اختصرت الفتوحات.

صوفیہ پر یہ الزام کہ وہ عالم کو عین حق کہتے ہیں اور ہر چیز کو عین حق سمجھتے ہیں، سرے سے غلط ہے، جو صوفیہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں وہ بھی حلول و اتحاد کا انکار کرتے ہیں، شیخ اکبر نے بھی اس کا انکار کیا ہے (موقع ملا تو اس پر سیر حاصل گفتگو کی جائے گی) واجب اور ممکن میں اتحاد و انضمام ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ ذات باری تعالیٰ نہ کسی میں حلول کر سکتی ہے، اور نہ اس کی ذات میں کوئی شے ضم ہو سکتی ہے۔ صوفیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ حلول و اتحاد سے قطعاً پاک و منزہ ہے۔ یہ باتیں اس کی شان الوہیت کو خلاف ہیں۔ البتہ صفات الہی کو صوفیہ نہ عین ذات کہتے ہیں اور نہ غیر ذات، عالم کو عین ذات کوئی نہیں کہتا، اس کے باوجود وحدۃ الوجود کے بارے میں اہل علم صوفیہ نے محتاط رویہ اختیار کیا ہے، اس پر زیادہ گفتگو کرنے اور عوام کے درمیان بیان کرنے سے منع کیا ہے، لیکن مکرمین تصوف وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو اٹھا کر اہل تصوف کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔

مقالہ نگار نے جس ہندوستانی صوفی کا قول پیش کیا ہے وہ سرے سے غیر اسلامی ہے۔ ہم اس سے اپنی برأت کا ظہار کرتے ہیں، یہ صوفیوں کا نظریہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی صفحے پر ابن عربی

کے جو حوالے ہیں وہ سب ان کی تحریف شدہ عبارت ہے، مقالہ نگار نے ان ہی سطور میں ظہور ذات اور ظہور صفات میں خلط مبحث کیا ہے۔ صوفیہ انسان میں ظہور صفات کے قائل ہیں نہ کہ ظہور ذات کے، ظہور ذات کا جملہ اختیار کیا بھی جائے تو اس سے صفات باری تعالیٰ کی تجلی مراد ہوگی۔ جسم انسانی میں اس کا حلول مراد نہیں ہو سکتا۔ ظہور صفات سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت، ارادہ، سمع، بصر، تکلم اور اس کی صفات عالیہ، شفقت، رحمت، غفو، درگزر اور کرم مراد ہیں، جو انسان کو بقدر ما بحتاج عطا ہوئی ہیں، اس کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اور اس کو تسلیم کرنے سے شرک کیسے لازم آئے گا؟ مقالہ نگار کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف اور اہل تصوف کو مطعون کرنے کے لئے جہاں جو رطب و یابس ان کو ملا ہے سب کو جمع کر لیا ہے اور ان سب کو جملہ صوفیائے کرام کا نظریہ قرار دے دیا۔ نہ اصل مآخذ اور کتاب دیکھی ہے اور نہ ان کتابوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، حاطب اللیل کی طرح رطب و یابس جمع کر لئے، اس کی واضح مثال وہ شعر ہے جو انہوں نے صفحہ ۱۰۱ پر نقل کیا ہے۔ جیسا کہیں سنا ہوگا ویسا ہی نقل کر دیا۔ یہ آئی غازی پوری کا شعر ہے، ان کے دیوان میں دیکھا جاسکتا ہے، اس کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے۔

”وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مستوی عرش ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ البتہ اس کے انوار و تجلیات اور اس کی صفات عالیہ (شفقت، رحمت، غفو، درگزر اور کرم وغیرہ) کا ظہور حضرت رسول اللہ کی صورت میں دنیا والوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کیا گیا ہے۔ شاعر نے خود وضاحت کی ہے کہ اس شعر میں نزاکت ہے ”ہے“ کی جگہ پر ”تھا“ پڑھیں گے تو کفر ہوگا۔ ”ہے“ اور ”تھا“ میں جو فرق ہے وہ مقالہ نگار خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ کسی کی بات غلط نقل کر دینا خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور کہاں کہاں انہوں نے اس قسم کی خیانت کی ہے تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کا مقصد اہل تصوف کو بدنام کرنا ہے۔ اسی لیے ان کے انداز تحریر سے اہل تصوف کے خلاف شدید بغض و عناد ظاہر ہوتا ہے۔

اگر صوفیہ، یہود، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین سب کو برابر سمجھتے اور اصنام میں جلوہ خداوندی کے قائل ہوتے تو اسلام کی دعوت کیوں دیتے، کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو اسلام

کی طرف لانے کی عظیم خدمت اہل تصوف نے ہی زیادہ کی ہے۔

اگرچہ بات طویل ہو جاتی ہے لیکن شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی مقالہ نگار نے تہذیب و متانت سے پرے ہو کر جتنی لعنت و ملامت کی ہے اس کے پیش نظر شیخ کی وہ عبارت پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں شیخ نے اپنے عقیدہ حقہ کی وضاحت فرمائی ہے، پوری عبارت امام شعرانی کی کتاب ایواقیت والجواہر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اہم حصہ یہ ہے۔

فيا اخوانى ويا احبابى رضى الله عنكم وعنانى اشهد الله تعالى
واشهد ملائكتہ و انبياءہ ومن حضر من الروحانيين او سمع انى اقول
قولاً جاز ما بقلبي ان الله تعالى اله واحد لا ثانی له منزہ عن الصاحبۃ
والولد ما لك لا شريك له ملك لا وزير له صانع لا مدبر معه موجود بذاته
من غير افتقار الى موجود يوجده بل كل موجود مفتقر اليه فى وجوده
فالعالم كله موجود به وهو تعالى موجود بنفسه لا افتتاح بوجوده ولا
نهاية لبقائه بل وجود مطلق قائم بنفسه ليس بجوهر فيقدر له المكان
ولا بعرض فيستحيل عليه البقاء ولا بجسم فيكون له الجهة والتلقاء
مقدس عن الجهات والاقطار مرئى بالقلوب والابصار استوى على عرشه
كما قاله وعلى المعنى الذى اراده كما ان العرش و ما حواه به استوى وله
الآخرة والاولى ليس له مثل معقول ولا دلت عليه العقول لا يحدہ زمان
ولا يحويه مكان وهو الآن على ما علمه كان لانه خلق المتمكن والمكان
وانشاء الزمان ۔

شیخ کا یہ بیان منکرین تصوف اور مخالفین شیخ کے پڑھنے کے لائق ہے، اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو کتاب و سنت سے معارض ہو، اس عبارت سے ظاہر ہے کہ شیخ کا عقیدہ وحدۃ الوجود کے بارے میں وہ نہیں ہے جو مقالہ نگار نے جا بجا پیش کر کے ان پر الحاد اور شرک کا الزام عائد کیا ہے، بہر حال یہ ایک تفصیلی گفتگو کا موضوع ہے۔

ہم مقالہ نگار کے دوسرے مزمومات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ آیت کریمہ ہو الاول

والآخر والظاهر والباطن، کی تشریح اتنی سہل بھی نہیں ہے کہ مقالہ نگار نے علامہ شبلیؒ کی بات چٹکیوں میں اڑادی، شبلی جیسا ماہر لسانیات اور استاذ زمانہ ”وہو بکل شیء علیم“ کا جملہ نہ سمجھ سکا؟ حیرت ہے موصوف کی دیدہ دلیری پر۔ وہ اس قسم کی بات کر رہے ہیں جیسے ان کے مقابل کوئی طفل مکتب ہے۔ پوری آیت مبارکہ میں صفات کے درمیان ”و“ آکر ہر لفظ میں معنوی مغایرت پیدا کر رہا ہے اور بکل شیء علیم سے قبل ”و“ آکر ماقبل سے مابعد کے مفہوم کو الگ کر رہا ہے۔ ہو الاول سے شیء علیم تک مضمون و مفہوم ایک نہیں ہے۔ پوری آیت کریمہ سے صرف احاطہ علمی مراد لینا مضمون نگار کے فہم قرآن سے ناواقفیت کی دلیل ہے، بلکہ وہ عربی زبان کے رموز سے بھی ناواقف ہیں۔ اگر ہو الاول والآخر والظاهر والباطن، سے احاطہ علمی بیان کرنا مقصود ہوتا تو وہو بکل شیء علیم لانا عبث ہوتا اور یہ ممکن نہیں ہے۔ موصوف خود ہی نہیں سمجھ سکے اس آیت کریمہ کو اور علامہ شبلیؒ پر تنقید کر دی ”خود فراموشی کند تہمت دہد استاد را“ باری تعالیٰ کی یہ صفات اربعہ درحقیقت اس کے وجود کی وحدت کی طرف اشارہ کرتی ہیں علامہ شبلیؒ کی اتنی عمدہ وضاحت بھی جن کی سمجھ میں نہ آسکے تو پھر ان کو کون سمجھائے؟ حدیث شریف میں تو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کو مطلقاً باطل قرار دیا گیا ہے۔ وہاں معبود اور الہ کا بھی ذکر نہیں۔ دیکھئے بخاری ج ۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اصدق بیت قالہ الشاعر الاکل شیء ما خلا اللہ باطل۔ (صحیح بخاری ج ۲، صحیح مسلم، کتاب الشجر جلد دوم)

توحید کے درجات پر بھی مضمون نگار کو اعتراض ہے۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تشریحات توحید ذاتی و صفاتی کو مذموم بنا کر پیش کیا ہے اور حسب عادت غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ سورہ اخلاص اور بنی اسرائیل کی آیات نقل کر کے مقالہ نگار نے ص ۱۸ پر توحید کی جو تشریح کی ہے حاشا وکلا کہ کسی صوفی یا عالم دین کو بلکہ ایک ادنیٰ مسلمان کو بھی اس سے اختلاف ہو۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب یا دیگر متقدمین صوفیہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ توحید کی کیفیات اور اس عقیدہ کو تسلیم کر لینے کے اثرات و نتائج ہیں۔ وہ قرآن کریم سے ہرگز معارض نہیں ہے۔ رہ گیا توحید صوفیہ سے اصحاب رسولؐ کی تحقیر ہونی تو یہ مقالہ نگار کی کج فہمی ہے۔ عہد صحابہ میں احوال و

کیفیات کے لئے زبان بیان نہیں تھی، لیکن کیا صحابہ کی توحید اسی درجہ کی تھی جس درجہ توحید کے حامل مضمون نگار اور ان کے ہم مذہب ہیں؟ اگر انہیں یہ خوش فہمی ہے تو اس کو کیا کہا جائے۔

ع دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

امام غزالی اور شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلاشبہ توحید کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ موصوف مقالہ نگار وجود میں شرکت کے قائل ہیں تو یہ ان کی توحید کا مرتبہ ہوا۔ اہل تصوف شرکت فی الوجود کو بھی توحید خالص کے منافی سمجھتے ہیں۔ یہ دوئی جب ختم ہوگی تو فنا فی التوحید کا مرتبہ حاصل ہوگا اور جب بندہ مقام فنائیت پر پہنچ جائے گا تو اس پر کشف و اشراق اور علم و ادراک کے تمام درکھل جائیں گے۔ یہ غیب نہیں ہے۔ غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہی ہے۔ اللہ اپنے نبیوں کو جتنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ - (ہود ۴۹)

عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ
(الحج ۲۶-۲۷)

وَأَنْبِئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ - (آل عمران ۴۹)

اور اس جیسی دوسری آیات ایک سمجھدار آدمی کے لئے کافی ہیں۔ آیت کریمہ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (البقرہ ۵۵) سے ظاہر ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں کا بندے پر منکشف ہو جانا بندے کے حدامکان میں ہے۔ بخاری کی یہ حدیث فنائیت ہی ثابت کرتی ہے۔

من عادى لي وليا فقد آذنته بالحرب وما تقرب الي عبدي بشيء
احب الي مما افترضت عليه ولا يزال عبدي يتقرب الي بالنوافل حتى
احبته فكننت سمعه الذي يسمع به وبصره الذي يبصر به ويده التي
يبطش بها ورجله التي يمشي بها وان سالني لا اعطيه ولا ان استعاذني
لا اعيننه وما ترددت من شيء انا فاعله ترددي عن نفس المومن يكره
الموت وانا اكره مسئلته - (بخاری ج ۲ باب التواضع عن ابی ہریرہ)

اولیاء اللہ کی اس بڑھی ہوئی کیفیت اشراقی کو علم الہی کے برابر سمجھنا غلط ہے۔ علم الہی کی

ہم سری تو ممکن ہی نہیں ہے۔ علم الہی حد و نہایت سے ورا ہے۔ کائنات ارضی اپنی وسعت کے باوجود علم الہی کے سامنے رائی کے دانے سے زیادہ نہیں ہے۔ ماہرین فلکیات نے ثابت کیا ہے کہ فضا بے بسیط میں بے شمار کہکشائیں گردش میں ہیں۔ بعض تو زمین سے زیادہ بڑی ہیں۔ ان بے شمار عوالم میں عالم ارضی کا کسی بندے پر منکشف ہو جانا معمولی بات ہے۔ اس سے علم الہی کی ہمہ گیری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اقطاب و ادتاد کا ذکر بعض احادیث میں ہے۔ اس پر اعتراض کم علمی ہے۔ مقالہ نگار نے سورہ اعراف کی جو آیت صوفیہ کے موقف کے رد و ابطال میں پیش کی ہے وہ استدلال ”الا بما شاء“ سے خود ہی رد ہو جاتا ہے۔ غیب ہو یا کشف ہو وہ سب مشیت الہی سے ہی متعلق ہے، مشیت الہی نہ ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ عالم غیب کیا عالم مشاہدہ بھی بندہ کی دست رس سے باہر ہوگا۔ قسط اول کے ص ۲۲ میں مقالہ نگار نے اولیاء اور اقطاب اور ان کے روحانی تصرفات پر طنز و تعریض کی ہے اور اس کو صوفیوں کی اولیاء پرستی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ مقالہ نگار نے خود تسلیم کیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا وجود اس کائنات میں بالذات قوت و اقتدار کا مالک نہیں ہے“ (۲۰) اس دعویٰ کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کی مرضی سے بالعرض قوت و اقتدار کا مالک ہو سکتا ہے۔ اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد کیوں اتنا دواویلا ہے۔ یہ سب مزعومات اور ہفوات قابل بحث ہی نہیں ہیں۔ ان چیزوں کا امکان کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ وقوع میں آئے یا نہ آئے۔ رسالت کے متعلق صوفیہ کا عقیدہ وہی ہے جو کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ شیخ عبدالکریم جیلی کی عبارت محل نظر ہے۔ آیا وہ انہیں کا قول ہے یا تحریف؟ انہوں نے کیا کہنا چاہا ہے؟ ان کی کتاب کی پوری عبارت کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ واقعی ختم نبوت کے منکر ہوتے تو اہل تصوف کے حلقہ میں کب کے مردود و مطعون ہو چکے ہوتے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اپنے شیخ کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا۔ اس مشکوک بات کو مقالہ نگار نے تمام صوفیہ کا عقیدہ بنا دیا۔ عند اللہ اس تہمت اور بہتان پر جواب دہی کا احساس ہونا چاہیے۔ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغَيْرِ مَا كَتَبْنَا فَتَقَدِّحُوا حَتَّمَلُوا بُهْتَانًا وَإِنَّمَا مُبِينًا۔ (الاحزاب ۵۸)

ایسا تو نہیں کہ مقالہ نگار یہود نصاریٰ کی روش پر چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یاد سے

مسلمانوں کو غافل کرنا ان کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہے۔ ذکر اور دوام ذکر پر قرآن کی آیات اتنی ہیں کہ ان سطور میں ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اس کو غلط قرار دینا اور اس کا استہزاء کرنا ایک مومن کا کام نہیں ہو سکتا۔ مولانا عبدالباری ندوی کے رد میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر طفلانہ اور سطحی ہے کہ اس کا جواب دینا بھی بار خاطر محسوس ہو رہا ہے۔ آل عمران کا پورا آخری رکوع اس بات کا شاہد ہے کہ مقالہ نگار کا دعویٰ اور دلیل دونوں ان کی کم علمی کا ثبوت ہے۔ ان آیات سے دوام ذکر کے ساتھ تعلق مع اللہ ثابت ہو رہا ہے۔ تخلیق ارض و سماء میں تفکر کا نتیجہ ایمان میں مزید پختگی کا سبب ہے اور تبتل اور انابت الی اللہ کی کیفیات اس سے راسخ ہوتی ہیں۔ تفکر تخلیق ارض و سماء سے شاید مضمون نگار صوفیوں کو سائنس دان بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی کوئی بات اشارہ بھی آیات سے ظاہر نہیں ہوتی۔ مغالطہ انگیزی مقالہ نگار کی تحریر سے واضح ہے۔ مراقبہ اور مشاہدہ حق کو عجمی چیز کہنا رموز دین سے بے خبری ہے۔ جو شخص مسلمانوں کو کثرت عبادت اور کثرت ذکر سے روکتا ہو اس کا مومن ہونا مشکوک ہے۔ یہ کام نصاریٰ، یہود اور مشرکین کا ہے۔ افسوس کہ نفس پرستوں کی اس بھیڑ میں خدا پرست بے آبرو ہو رہے ہیں۔ ہم مقالہ نگار کو دو آیت کریمہ پر فکر کی دعوت دیتے ہیں، وَادْخُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرَّعًا وَخِيْفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ (الاعراف ۲۰۵)۔ رَجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَقَامِ الصَّلَاةِ وَاتَّبَاءِ الزَّكَاةِ (النور ۳۷) ایک آدمی کس طرح دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرے اس کی زبان بھی نہ ہلے۔ آواز بھی نہ نکلے۔ صبح سے شام تک یاد الہی میں لگا رہے۔ خرید و فروخت اور امور تجارت میں مصروف رہے اور یاد الہی سے ایک لمحہ کی غفلت بھی نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اہل تصوف پر رہبانیت کا الزام نیا نہیں ہے۔ مقالہ نگار اپنے ان ہی اسلاف کی ترجمانی کر رہے ہیں جو تصوف کے منکر و معاند تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں نے بھی رہبانیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ منکرین کے پھیلائے ہوئے پروپگنڈے سے متاثر ہو گئے۔ رہبانیت کا لفظ سن کر ہی ان کی پیشانی پر بل آ جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں سورہ حدید کی یہ آیت کریمہ وَرَهْبَانِيَّةٍ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا کی صحیح تشریح نہیں کی۔

مقالہ نگار نے اس لفظ کی آڑ لے کر خوب خوب صوفیوں کو مطعون کیا ہے، مقالہ نگار کو آخرت میں جواب دہی کا ذرہ برابر احساس ہو تو وہ بتائیں کہ سورہ حدید کی اس آیت کریمہ سے کس طرح رہبانیت کی مذمت اور نفی ثابت ہو رہی ہے؟ آیت مذکورہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے نصاریٰ کو رہبانیت کا مکلف نہیں بنایا تھا۔ انہوں نے رضائے الہی کے لئے یہ راہ خود منتخب کی۔ پھر رہبانیت کی رعایت نہ کر سکے۔ یہاں رہبانیت کو اللہ تعالیٰ نے مذموم نہیں قرار دیا ہے۔ اگر رہبانیت (یعنی اپنے ایمان کی حفاظت، ضبط نفس اور حب دنیا سے بچنے کے لئے خلق خدا سے الگ ہو کر، لذات دنیوی کو چھوڑ کر ویرانہ صحرا میں اللہ کی عبادت کرنی) مذموم اور بری چیز ہوتی تو ”فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا“ نہیں کہا جاتا۔ ایک غلط اور غیر اسلامی فعل کی رعایت کیا معنی رکھتی ہے؟ مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ترک و تجرید کا فرض ہونا مصالح کے خلاف ہے۔ اس لئے ترک و تجرید کی زندگی نصاریٰ پر فرض نہیں کی گئی اور نہ مسلمانوں پر۔ لیکن رضائے الہی کے حصول کے لئے یہ راہ اختیار کی جاسکتی ہے۔ اباحت کا پہلو اس میں محفوظ ہے۔ فرضیت کی صورت میں ہر شخص اس کا مکلف ہوتا اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی، مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ سے رہبانیت کی مذمت ثابت کرنا تفسیر بالرائے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ ہی چیزیں ہم پر فرض عین کی ہیں جس کی قضا لازم کی ہے۔ اس کے باوجود ہم بہت سے مباحات پر التزاماً عمل کرتے ہیں۔ احادیث بھی اس کی تصدیق و تائید کرتی ہیں۔ بخاری کی حدیث ہے۔

يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتَّبِعُ بِهَا شَعْفَ الْجِبَالِ

ومواقع القطر يفر بدینه من الفتن۔ (المجلد الثانی باب من الدین الفرار من الفتن)

ترمذی کی حدیث اور واضح ہے۔ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای الناس افضل فقال رجل يجاهد فی سبیل اللہ۔ قالوا ثم من؟ قال مومن فی شعب من الشعب یتقی ربہ ویدع الناس من شہرة۔ (ابواب فضائل الجہاد) اس مضمون کی حدیثیں دیگر صحاح و سنن اور مسانید میں بھی ملیں گی۔

نصاریٰ کی رہبانیت عدم رعایت سے مطعون ہوئی۔ عقیدہ تثلیث اختیار کر لینا ان کی بنیادی خامی تھی۔ ازدواجی تعلقات سے دوری ان کی رہبانیت کی شرط اول تھی لیکن وہ بظاہر عوام

کی نظروں میں تعلقات زن و شو سے دور رہے، لیکن درون خانہ بدکاری کی راہ کھلی رکھی۔ وہ بظاہر تارک دنیا درویش بنے رہے لیکن ان کے ذاتی خزانے مال و زر سے بھرے ہوتے تھے۔ تفہیم القرآن میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں مولانا مودودی صاحب نے رہبانیت کی شرائط اور تفصیلات لکھی ہیں ان کو پڑھ جائیے۔ شریعت اور مذہب تو کجا عام اخلاق بھی ان کو گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ حدیث میں جس رہبانیت کی نفی کی گئی ہے وہ نصاریٰ کی یہی رہبانیت ہے جس کی نظیر عہد رسالت میں موجود تھی ورنہ رہبانیت خوف خدا کے مفہوم میں قطعاً غیر اسلامی چیز نہیں ہے۔ چونکہ رہبانیت نصاریٰ کی بے اعتدالیوں سے مطعون ہو چکی تھی اس لئے اس لفظ کا استعمال مسلمانوں میں تقریباً متروک ہو گیا۔ اس کی جگہ ’ترک دنیا‘ نے لے لی، ترک دنیا کے لفظ پر بڑا اوویلا ہے حالانکہ اس کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے، عبادات میں یکسوئی کے لئے، نفس کی سرکشی پر قابو پانے کے لئے خلق خدا سے دور رہنا اور آسائش دنیوی کو چھوڑ دینا ترک دنیا ہے۔ نصاریٰ کی رہبانیت اور اہل تصوف کے ترک دنیا میں بعد المشرقین ہے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ اہل تصوف کی تمام دینی اور اخلاقی خدمات محفوظ ہیں۔ ان کی تاریخ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ جھوٹے پروپیگنڈے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔ جن صوفیوں نے ترک و تجرید کی راہ اختیار کی وہ کبھی کسی اخلاقی برائی میں ملوث نہیں ہوئے۔ جنہوں نے حکومت و سلطنت چھوڑی وہ کبھی زندگی میں مال و دولت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ جس راہ پر انہوں نے قدم رکھا تا دم آخر ثابت قدم رہے۔ وہ ”فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا“ کے ہرگز مصداق نہیں ہیں۔ رہبانیت کے نام پر مغالطے دینے والے منکرین تصوف نے تمام صوفیوں کو صحراؤں اور جنگلوں میں پہنچا دیا اور سب کے بارے میں تاثر دینے کی کوشش کی کہ سب رہبانیت کے قائل اور رہبانیت کی راہ پر ہیں۔ انفرادی طور پر چند اہل تصوف کو چھوڑ کر سارے صوفیہ تارک دنیا نہیں ہو گئے تھے۔ تاریخ موجود ہے۔ مگر افسوس سوائے ظن رکھنے والے سے حسن ظن کی توقع فضول ہے۔ صوفیوں کے موجودہ خانوادے اس بات کی دلیل ہیں کہ انہوں نے معاشرتی زندگی قوم کے درمیان گذاری۔ اسلام کی اشاعت کی، لوگوں کی تہذیب نفس کی، درس و تدریس کی مسندیں آباد کیں، معاشرے کی اصلاح کی، ازدواجی زندگی بسر کی، اولاد کی پرورش کی، اقرباء کے حقوق ادا کرتے رہے اور

ساتھ میں حب جاہ اور فتنہ دنیا سے بھی بچے رہے اور ایسے صوفی بھی تاریخ کے ابواب میں روشن ہیں جنہوں نے باقاعدہ جہاد کیا۔ ایمان کی حفاظت جان و مال کی حفاظت سے زیادہ اہم ہے، امت میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو ہوس پرست انسانوں، عیاش امراء، ظالم حکمرانوں اور دولت و مناصب کی طرف بھاگتے دوڑتے اپنے بھائیوں کو دیکھ کر اپنے ایمان کے بارے میں اتنے خوف زدہ ہوئے کہ جنگلوں اور صحراؤں کی راہ لی۔ یہ تھوڑے لوگ تھے، لیکن منکرین تصوف نے جھوٹے پروپگنڈے سے رائی کو پہاڑ بنا دیا۔

بخاری اور ترمذی کی حدیث کے مطابق فتنہ دنیا سے فرار حاصل کر کے محفوظ جگہ اختیار کر لینا یا گوشہ نشین ہو جانا ہرگز قابل مذمت نہیں ہے۔ سورہ حدید کی آیت کریمہ سے اگر نصاریٰ کی رہبانیت کا رد ہوتا ہے تو صوفیائے کرام کے ترک و تجرید اور رہب و خوف کا اثبات ہوتا ہے۔ تنگ نظری، نفسانیت اور عصبیت جاہلیہ کی طرح تعصب کا پردہ عقل پر نہ ہو تو یہ بات سمجھ لینی مشکل نہیں۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنہوں نے ایمان کی حفاظت کے لئے معاشرہ سے علیحدگی اختیار کی وہ عزیمت پر نہیں بلکہ رخصت پر عمل کرنے والے لوگ ہیں۔

مقالہ نگار کا منشاء مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی یادوں سے دور کر دینا ہے۔ صلوٰۃ معکوس کے جواز پر مولانا اشرف علی تھانوی نے بہت مناسب دلیل دی ہے لیکن مضمون نگار کو وہ بھی ہضم نہیں ہوئی اور ان پر غلط تاویل میں مہارت کا الزام لگا دیا۔ یہ یاد رہے کہ اس عمل کو صلوٰۃ معکوس کہتے ضرور ہیں لیکن حقیقت میں یہ کوئی رکوع و سجود والی نماز نہیں ہے بلکہ ذکر کا ایک طریقہ ہے۔

قلب و ذہن کو ماسوا اللہ کے خیال سے پاک رکھنا اہل تصوف کے یہاں توحید کا لازمہ ہے۔ وہی بات شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھی ہے۔ مقالہ نگار کو اس پر بھی اعتراض ہے۔ مقالہ نگار نے اس کو غیر منصوص قرار دیا ہے یعنی قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا۔ کچھلی سطور میں سورہ اعراف کی آیت کریمہ ہم نقل کر چکے ہیں۔ اس میں ولا تکن من الغافلین کہہ کر ذرا الہی میں غفلت سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور اپنی یاد میں ہمہ وقت منہمک رہنے کا حکم دیا ہے۔ ”تصحیح خیال“ کی جو بات شاہ ولی اللہ صاحب نے کی ہے (یعنی غیر اللہ کی یاد اور خیال سے قلب و دماغ کو پاک

رکھنا) اس میں اور قرآن کے مطابق ذکر الہی سے غافل نہ رہنے میں کیا فرق ہے؟ دونوں باتیں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں جب بندہ ہمہ وقت دل و دماغ سے اللہ کی طرف ذکر کے ذریعہ متوجہ رہے گا تو پھر غیر اللہ کا گزر کہاں ہوگا؟ اس لئے تصحیح خیال کو غیر منصوص کہنا غلط ہی نہیں قرآن کے تصور توحید کے بھی خلاف ہے۔

مقالہ نگار نے اہل تصوف کی مغالطہ انگیزی کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ اہل تصوف (بشمول سلف و خلف) کی شخصیات پر اور ان کی نیتوں پر براہ راست حملہ ہے، یہ بات اخلاقی طور پر صحیح نہیں ہے اور مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن رکھنے کی نبوی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔ کیا اب قلم کا کوئی معیار نہیں رہا؟ جب پڑھے لکھے لوگوں کا یہ اخلاق ہے تو کم علموں اور جاہلوں کا کیا انداز ہوگا؟ کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن ان سطور میں سب کی گنجائش نہیں ہے، اہل علم کو چاہیے کہ مقالہ نگار کی تحریر کا تفصیلی جائزہ لے کر تصوف سے گرد و غبار کو دور کریں۔

بزم صوفیہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ حضرت شیخ ابوالحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی، صدر الدین عارف، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ بوعلی قلندر پانی پتی وغیرہ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل، ان کے ملفوظات اور تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔

قیمت ۳۰۰ روپے

اخبار علمیہ

”جرمنی میں اسلامی شریعت کے مطابق تاریخ ساز فیصلہ“

عربی روزنامہ ”سبق الیکتر ونیہ“ کے مطابق ترکی نژاد میاں بیوی میں گھریلو جھگڑے کے سبب طلاق ہوگئی، شوہر نے بیوی کو ۱۲ ہزار یورو کے زیورات مہر میں دیے تھے، طلاق کے بعد شوہر نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور جرمنی کے شہر لمبرگ آن ڈیرلان (Limburg an der Lahn) کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تو جرمن جج نے اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ میں کہا کہ مہر کے زیورات شوہر کو واپس نہیں دیے جاسکتے، یہ بیوی کا شرعی حق ہے۔ جرمن ذرائع ابلاغ نے اس فیصلہ کو ملکی تاریخ میں اسلامی قانون کے مطابق ہونے والا پہلا فیصلہ قرار دیا ہے اور بارکنسل کے بعض مقتدر عہدے داروں نے ایک بیان میں کہا کہ جرمنی جمہوری ملک ہے اور اس کے قانون میں تمام مذاہب کی ترجمانی اور اس کا لحاظ لازمی ہے، اسلام یا کسی بھی آسمانی مذہب کا ایسا قانون جس میں انسان دوستی اور معاشرتی خیر سگالی پائی جاتی ہو، اس کو عدالتی دفعات میں جز بنانا ملک کی بقا و سلامتی اور امن کے لیے مضرت نہیں ہے بلکہ اس قابل تحسین اقدام سے اقلیت کے دل میں جرمنی سے تعلق اور اس کی عدلیہ پر اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ جرمنی کی اکیاسی ملین آبادی میں مسلمان ۴ ملین ہیں جس میں اکثریت ترکی نژاد ہے، اس فیصلہ سے جہاں جرمنی کے مسلمانوں اور جمہوریت پسند عیسائیوں میں خوشی ہے وہیں کلیسا کے ایوانوں میں ناراضی بھی ہے۔

”نمائز جو لے سوتی“

یہ وایانا ڈضلع کے پبلی کے ایک یتیم خانہ کی سربراہ سسٹر میری چانڈی کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور اس وقت اس کو خوب شہرت و مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، اس کی وجہ اس کی علمی، تحقیقی اور ادبی عظمت یا معیار و اسلوب بیان کی دلکشی و جاذبیت کے بہ جائے وہ سنسنی خیز انکشافات و حقائق ہیں جو مشینری کے کلیساؤں، تعلیمی اداروں میں ہونے والی شرمناک اور غیر اخلاقی حرکتوں کا بیان ہے، مصنفہ نے راہبوں، مبلغوں اور استادوں کے حیا سوز واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلیسا کی زندگی روحانیت کی بجائے شہوت رانی و ہوا پرستی کی ہوگئی ہے اس لیے اس کے ذمہ داروں کو اصولوں میں تبدیلی لاکر راہبوں کو باضابطہ شادی کی اجازت دے دینی چاہیے۔

”بودھوں کی اسلام دشمنی اور عصبیت“

عرب خبر رساں ایجنسی المصراوی کے مطابق سری لنکا میں سنہال اور تامل اکثریت کے علاوہ ۲ ملین یعنی ۲۰ لاکھ مسلمان ہیں، ۱۰ فیصد ہندو بھی ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں بدھوں کے قلوب بہ توفیق خداوندی نور اسلام سے منور ہو رہے ہیں، اسلام کی اس مقبولیت سے انتہا پسند بدھسٹوں کی آتش غضب بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سری لنکا کا سرکاری مذہب بدھ مت ہے، اس لیے مسلمانوں کی مذہبی سرگرمیاں محدود ہونی چاہئیں۔ جمعہ کی نماز عام دینی اجتماعات اور تبلیغ اسلام کی کوششوں پر پابندی ہونی چاہیے، خبر کے مطابق گزشتہ دس برسوں میں ۲ سو مسجدیں ان کی انتہا پسندانہ اور متعصبانہ حرکتوں کا نشانہ بن چکی ہیں۔ غنیمت ہے کہ حکومت کا طرز عمل معاندانہ نہیں ہے اور مسلمانوں کے ۵ سو ابتدائی اسکولوں اور ۲ سو دینی مدرسے قائم ہیں اور بعض تعلیمی اداروں کی حکومت سرپرستی بھی کرتی ہے۔

”ماسکو میں مدعی خدائی کی خودسوزی“

جینیوانامی ایک جدید مذہبی فرقہ ہے جس کا وجود اور نشو و نما صحرائے افریقہ کے بربروں سے منسوب ہے، موسیقی بالخصوص صوفی مذہبی نغموں اور رقص کو یک جا کر کے اس فرقے نے الگ مذہب نکالا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ رقص و موسیقی نماز اور زندگی کا جشن ہے، روس، وسط ایشیا کی ریاستوں چین، شمالی کوریا، سعودی عرب، ایران اور دیگر خلیجی ممالک میں اس مذہب پر پابندی ہے، اس کے باوجود اس فرقہ کے ۲ لاکھ افراد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس فرقہ کے ایک ۳۷ سالہ شخص نے اب خدائی کا دعوا بھی کیا، خبر کے مطابق اس نے اپنے اوپر مٹی کا تیل انڈیل کر خود کو آگ کے حوالہ کر دیا۔ یہ واقعہ ماسکو سے ۳۳ کلومیٹر کے فاصلہ پر پیش آیا، رپورٹ میں اس کا نام درج نہیں، روزنامہ مصنف حیدر آباد کے پہلے صفحہ پر یہ خبر شائع ہوئی ہے۔

”خودکشی کے متعلق ایک عجیب خبر“

برطانوی جریدہ ”ڈیلی میل“ کے مطابق جاپان کے ماؤنٹ فیوجی کے دامن میں Aokiguhara نامی سرسبز و شاداب اور نہایت گھنا ایک جنگل ہے، جہاں وہی شخص جاتا ہے جس نے اپنی زندگی سے رشتہ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو، ڈیلی میل سے گفتگو کرتے ہوئے ایک جاپانی شخص شینا کموڈا نے کہا کہ جاپانی

قوم شعبہ حیات کے ہر گوشہ میں انفرادیت کی ہمیشہ سے متلاشی رہی ہے، بہ حیثیت قوم اس نے روش عام سے الگ خودکشی کا الگ راستہ اختیار کیا ہے، صحافیوں نے اس جنگل میں بکھرا ہوا سامان اور درختوں، جھاڑیوں اور لہلہاتے پودوں کے درمیان قریب سولائیس دیکھیں، جنگل کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ ہم ان کے اقدام خودکشی کو قانوناً روک نہیں سکتے، ۱۲ء میں اب تک سو سے زیادہ لاشیں ان جنگلوں میں پائی گئیں۔

”گنیز بک میں دنیا کے کلب اصغر کا اندراج“

فروری ۲۰۰۸ء میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق لمبے بالوں والا ”بوؤ“ نامی کتے کی لمبائی ۶۱ سینٹی میٹر تھی، اس کا تعلق امریکی ریاست کیٹکی سے تھا لیکن اب یہ ریکارڈ مس ایزل کے ساتھ شمالی مشرقی پورٹوریکن ٹاؤن، ارجنٹائن سے بھی وابستہ ہو گیا ہے، Chihuahua نسل سے تعلق رکھنے والے اس کتے کی لمبائی ۵۳، ۶۱ سینٹی میٹر اور وزن ایک کیلے کے برابر ۷۰۰ گرام ہے، پیدائش کے تین ہفتہ بعد اس کے قد و قامت میں ایک سینٹی میٹر کا بھی اضافہ نہیں ہوا تو اس کی مالکن اسے ذرائع ابلاغ کے سامنے لائیں، ان کا کہنا تھا کہ شروع میں اس کا منہ اس قدر چھوٹا اور تنگ تھا کہ دودھ بھی نہیں پی سکتا تھا، اس لیے آئی ڈراپ کے ذریعہ اس کو دودھ دیا جاتا تھا۔ گنیز بک کی ٹیم اس کے حجم کی تصدیق کے لیے پورٹوریکن پیچنچے والی ہے۔

”ایک خوش نما خوش رنگ پودے کی خوراک“

Nepenthaceae سے نسلی تعلق رکھنے والے Nepenthes Spathulata نامی انتہائی دلکش اور جاذب نظر پودا جاوا اور سماٹرا کے گرم علاقوں میں پایا جاتا ہے، اس کا تنا پانچ میٹر تک بڑھتا ہے، بالائی حصہ تقریباً ایک میٹر لمبا صراحی نما ہوتا ہے، خاص بات یہ ہے کہ چوہے اور گلہری وغیرہ جیسے جانور جب کشش کے سبب اس کے پاس بالائی حصہ میں پہنچ جاتے ہیں اور پھسل کر اندر سماتے چلے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ پودے کی چٹائی سطح میں موجود خامرے ان شکاروں کو ہڈیوں سمیت ہضم کر جاتے ہیں، گوشت خور پودوں کا انکشاف تو اس سے قبل ہو چکا ہے، ہڈیوں اور دانتوں کو بھی نگل جانے والا یہ پودا پہلی بار دنیا کے ماہرین علم نباتات و حیوانات کے سامنے آیا ہے، تفصیلی رپورٹ بوٹانیکل جرنل ”لینین“ میں شائع ہوئی ہے۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

غالب اور بدایوں

۱۰ دسمبر ۲۰۱۱ء

21/112A گاڑھی خانہ،

فتح گڑھ، فرخ آباد

مدیر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نومبر کے معارف میں ڈاکٹر شمس بدایونی کی کتاب ”غالب اور بدایوں“ پر ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا طویل تبصرہ نظر سے گذرا۔ ڈاکٹر لطیف جیسے معمر محقق کا اس کتاب پر کچھ لکھنا اس کے معتبر ہونے اور مستند ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مجھے اس تبصرے کے حوالے سے دو باتیں عرض کرنا ہیں۔

اول: یہ کہ اس تبصرے میں دو جگہ کتابت کی فاش غلطیاں ہیں، صفحہ ۳۷۱ سطر نمبر ۶ پر ”مزار غالب نامی کتاب“ کو مزار غالب لکھ دیا گیا ہے اسی طرح صفحہ ۳۸۶ سطر نمبر ۷ پر علو (ع ل و) کو غلو لکھا گیا ہے۔

دوم: یہ کہ ڈاکٹر لطیف نے بعض بدایونی تلامذہ غالب کی نسبت بدایوں اور نسبت تلمذ کی بابت لکھا ہے کہ وہ ”محقق نہیں“ بایں وجہ یہ حصہ ”نظر ثانی کا محتاج ہے“ (صفحہ ۳۷۶)، اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ لطیف حسین صاحب کے نزدیک کسی شاعر کی وطنی نسبت کی اصل بنیاد محض اس کا اس جگہ پیدا ہونا ہے اگر اس شرط کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو غالب دہلوی اور میر دہلوی کے بارے میں کیا عذر پیش کیا جائے گا جب کہ ان دونوں کی پیدائش اکبر آباد میں ہوئی تھی۔

جہاں تک نسبت تلمذ کی بات ہے اگر معاصر ماخذ یا غالب کا کوئی خط تلمذ کی نشان دہی کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کو ناکافی سمجھنا اور ثبوت کا مطالبہ کرنا زیادتی ہے۔

اس مضمون سے کتاب کی اہمیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے بہت عرصہ کے بعد ایک اہم اور نئے موضوع پر تحقیقی کتاب شائع کی۔ عصر حاضر میں تحقیق کا معیار جس تیزی سے گر رہا ہے یہ کتاب اس معیار کو برقرار رکھنے کا ایک خوبصورت وسیلہ بن گئی ہے میں اس کتاب کے مصنف، مبصر اور ناشرینوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نیا زمند

محمد رضوان احمد

مطبوعات جدیدہ

ذالك الكتاب : از جناب احمد ابوسعید، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد ۱
گرد پوش، صفحات ۳۶۲، ہدیہ ۲۰۰ روپے، بذریعہ بک سیلر ۱۰۰ روپے، پتہ: شان پبلی
کیشن 8-3-229/42 یوسف گوڑہ، طاہر ویلی، حیدر آباد ۴۵۔

قرآن مجید کی تفہیم اور ترجمانی کے لیے اس مفید کتاب کے مولف کی ایک بڑی قابل قدر کاوش کا ذکر ان سطروں میں پہلے آچکا ہے، یہ کتاب بھی اسی قرآنی خدمت ہی کا جزو ہے جس میں قرآن مجید کی تمام سورتوں کا عام فہم ترجمہ اور زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر چھوٹے چھوٹے جملوں میں ترجمانی اس طرح کی گئی ہے کہ ہر رکوع کی اول و آخر آیتوں کا حوالہ ہے اور پھر جامع اختصار سے ان کا ترجمہ اور تشریح ہے، محترم مولف کی زندگی کا مقصد ہی گویا یہی ہے کہ ہر مسلمان قرآنی تعلیمات سے دلچسپی رکھنے والا اور براہ راست استفادہ کرنے والا بن جائے، قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے فہم کا ذوق ہی ہمارے مسائل کی شاہ کلید ہے، ان کی خواہش تو یہی ہے کہ قرآن مجید کا اصل لطف تو عربی زبان جاننے میں ہے، اسی لیے ان کی نظر میں یہ کام اولیت رکھتا ہے، تاہم اس کے بغیر بھی قرآن مجید کی روح سے ہم کنار ہونے کی کوشش جس طرح مترجمین و مفسرین نے کی ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے، اسی لیے انہوں نے اس کتاب میں ترجمانی کے لیے کسی مخصوص تفسیر یا ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے سامنے بیسیوں ترجمے رہے، یہ ان کی احتیاط اور نیت کی برکت ہے کہ اس کتاب کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے، زیر نظر پانچویں اور تازہ ترین اشاعت ہے اور مترجم کے الفاظ میں کوشش یہی رہی کہ ہر اشاعت بہتر سے بہتر ہو، معنوی بھی اور ظاہری بھی، مثلاً رنگین طباعت میں مدنی سورتوں کا رنگ ہر رکھ کر مدنی آیات کی پہچان کو آسان تر بنا دیا گیا، توقع ہے کہ یہ کاوش مرتب کی نیت اور آرزوں کے عین مطابق کارآمد، نفع بخش اور موجب اجر ثابت ہوگی۔

اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء : از مولانا سعید الرحمن الاعظمی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ فردوس،
مکرم نگر لکھنؤ اور مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

تحریک ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاریخ، دراصل انیسویں صدی کے اواخر سے

اب تک ہندی ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی گویا ایک تاریخ ہے، روایات اور عصری ضرورت اور ملت کے مختلف الابعاد نظریات اور رجحانات کو مثبت، نافع اور مستقیم سمت دینے کی ندوۃ العلماء کی نیت اور کوشش، نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے گہرے اور غیر جانب دارانہ مطالعہ و تجزیہ کی متقاضی ہے، ادعا نیت سے اس تحریک کو ہمیشہ نفور رہا، اعتصام بحبل اللہ اور امت مسلمہ کی خیر خواہی اور اسلام کی سر بلندی کے لیے باخبری اور شعور کی سلامتی نے اس تحریک کو بہر حال عام امت کی نظر میں وقعت بخشی اور ان کے دلوں میں عزت بھی بخشی، زیر نظر کتاب میں ثقافت کے لفظ کا ابہام پہلے ہی باب سے دور کر دیا گیا کہ اسلامی ثقافت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے اور ندوہ کا بنیادی مقصد اسی قرآن کریم اور اس کے علوم کی نشر و اشاعت ہے، عربی زبان و ادب میں ندوہ کے امتیاز کی شہرت محض لغات و لسانیات تک محدود نہیں بلکہ یہ امتیاز صرف قرآن کریم کی خدمت کی بدولت ہے، آج ندوہ کسی نہایت ترقی یافتہ تعلیمی ادارے کی طرح مختلف کلیات و معاہدے سے معمور ہے اور ہر شعبہ متحرک اور فعال ہے لیکن دعوت الی اللہ، ارشاد و اصلاح معاشرہ کے بلند مقاصد میں صرف ایک جذبہ کار فرما ہے اور وہ ہے قرآن اور شارع اسلام کے پیام کو عام کرنا، اس کے پاک نیت بانیوں کا اخلاص ہی تھا کہ شیخ وقت مولانا امداد اللہ مہاجر کی نے ندوہ کے قیام کو تائید غیبی سے تعبیر کیا تھا، مولانا فراہیؒ و علامہ شبلیؒ سے موجودہ اساتذہ تفسیر و حدیث و لغت تک ایک کہکشاں ندوہ کی زمین کو رفعت میں آسمان بناتی رہی، اس کتاب میں اسی حقیقی اسلامی ثقافت کے فروغ میں ندوۃ العلماء کی خدمات کا مفصل و مدلل بیان خود ندوہ کے لائق ترین اور مستند ترین نمائندہ و نمونہ کے قلم سے ہے، فاضل جلیل مصنف عربی اور اردو دونوں زبانوں میں جس مقام رفیع کے حامل ہیں وہ محتاج تعارف نہیں، ندوہ کے وہ مہتمم ہی نہیں نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں ندوہ کے ہر مرحلہ تعمیر کے وہ رکن رکین بھی رہے ہیں، دقت نظر اور وسعت معلومات نے اس کتاب کو دستاویزی حیثیت دے دی ہے، ندوہ کی عصری معنویت، تحریک ندوہ اور عقیدہ ختم نبوت اور اسلامی ثقافت و مسائل و حقائق جیسے موضوعات اور اساطین ندوۃ العلماء کے تذکروں نے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں، مولانا واضح رشید ندوی کا یہ احساس قطعی برحق ہے کہ ندوۃ العلماء کی تابندہ فکر اور اس کے عالی مقام حاملین کا تذکرہ آج کے بگڑے ہوئے ماحول کے لیے خضر راہ ثابت ہوگا۔

بررسی ادبیات امروز ایران: از پروفیسر محمد استعلامی، مترجم ڈاکٹر رئیس احمد

نعمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۵۲، قیمت ۱۶۲ روپے، پتہ:

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ اور مکتبہ جامعہ لمٹڈ، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔

ایرانی ادبیات کے شائق، ہندوستان میں اب بھی کم نہیں ہیں، کلاسیکی فارسی شعروادب کی حکمرانی ماضی میں ایسی رہی کہ آج بھی اردو ادب اسی کی سلطانی کا خطبہ پڑھتا نظر آتا ہے، البتہ جدید اور معاصر ادب سے فارسی ادب سے واقفیت یا از کم شناسائی میں پہلے جیسی بات نہیں، لیکن زیر نظر کتاب کی ابتدائی تحریر سے یہ حیرت اور فزوں ہوئی کہ خود ایران میں عرصہ تک معاصر ادب سے بے اعتنائی برتی گئی، مصنف کتاب محمد استعلامی ایران کے مشہور استاد اور محقق اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، تہران سے کناڈا تک وہ فارسی زبان کی تدریس سے وابستہ رہے، یہ کتاب ان کی مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو ایرانی کالجوں کے طلبہ کی بنیادی نصابی ضرورت کی وجہ سے لکھی گئی، اس کا پہلا مقالہ فارسی ادبیات کے کلاسیکی ادوار کے عنوان سے بحیثیت مقدمہ کے ہے اور اس سے فاضل مصنف کی ژرف نگاہی ظاہر ہوتی ہے، سطر سطر پر معلومات کا ایک دفتر موجود ہے، موجودہ ایرانی زبان کی قدامت کو تین ہزار سال کی عمر دیتے ہوئے وہ اس کے ابتدائی لیکن مٹے ہوئے نقوش کا ذکر کرتے ہیں کہ آج کی کردی زبان کی بنیاد عہد ماد کی زبان ہے لیکن اب اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں، فارسی باستان اور اوستائی کا فرق کیا ہے، ساسانیوں نے زرتشتی خط سے کیسے مختلف اسلوب اور قلم پیدا کیے اور آغاز اسلام کی صدیوں میں ساسانی پہلوی کی کتابیں تو موجود ہیں لیکن اسلام کے بعد کی کسی فارسی کتاب کا پتا نہیں چلتا، ایسے اشکالات کے جواب واقعی دلچسپ ہیں، فارسی زبان میں سادہ نویسی کے باب میں مصنف کا یہ اقرار ہندوستانیوں کے لیے باعث حیرت بھی ہے اور مسرت بھی کہ سادہ نویسی کا اظہار ابوالفضل سے شروع ہوا، چودھویں صدی ہجری کے آغاز کا زمانہ غالباً زمانہ انقلاب ہے اس عہد کا ادب اور داستان نویسی اور پھر معاصر ایرانی شاعری، ڈرامہ نویسی اور بچوں کا ادب جیسے مباحث سے اس کتاب کے عنوان سے پورا انصاف کیا گیا ہے، لائق مترجم قارئین معارف کے لیے محتاج تعارف نہیں، ان کی فارسی سخن گوئی کا تو زمانہ معترف ہے لیکن ترجمہ نگاری میں ان کی صلاحیت بلکہ مہارت خوب ظاہر ہوئی، مشتملات میں ابواب کے ساتھ عناوین ہوتے تو یہ فہرست اور مفید ہو جاتی۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

- ۱- آداب و فضائل درود و سلام لمحققہ روح کائنات: ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔ قیمت ۹۰ روپے۔
- ۲- اقبال کا ایک مدوح، بھرتری ہری: تحقیق و ترجمہ پروفیسر عبدالستار دلوی، دائرۃ الادب ۳- نیو دیپ سوسائٹی، باندہ ریلکشمیشن، ممبئی۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔
- ۳- بچوں کی صحافت کے سو سال: ضیاء اللہ کھوکھر، عبدالحجید کھوکھر، یادگار لائبریری گوجرانوالہ۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔
- ۴- شبلی سخنوروں کی نظر میں: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ اور دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ قیمت ۳۰۰ روپے
- ۵- علامہ فضل حق اور انقلاب ۱۸۵۷ء: ایس اختر مصباحی، دارالقلم، ذاکر نگر نئی دہلی۔ قیمت ۶۰ روپے۔
- ۶- علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری: ڈاکٹر راحت سلطانہ، نشاط پبلیشرز، ۲۲۶/۹-۴-۲۰-محبوب چوک، حیدرآباد۔ قیمت ۲۰۰ روپے۔
- ۷- عہد نبوی کے غزوات و سرایا اور شہدائے اسلام (حصہ دوم): مولانا انوار احمد صاحب اعظمی خیرآبادی، جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں۔
- ۸- قرآن منظوم (جلد پنجم): پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد، دارالاشاعت اسلامیہ ۸/مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کوموٹولہ) کولکاتا-۷۳۔
- ۹- مولانا سید محمد عبدالمسیح ندوی حیات و خدمات، اوصاف و کمالات: محمد عبدالرشید (ریاض)، کمپیوٹر اردو کتابت سنٹر، ندوی منزل، ندوہ روڈ لکھنؤ-۷۳۔ قیمت ۶۰ روپے۔
- ۱۰- نصیر الدین ہاشمی حیات اور ادبی خدمات: پروفیسر محمد افضل الدین اقبال، مکان نمبر ۸۵۵-۳-۱۱، نیو ملے حیدرآباد۔ قیمت ۲۵ روپے۔